# زرد پتّے

نوبہار صابر

مصنّف : نوبہار صابر

سالِ اشاعت : جنوری ۱۹۷۸ء

قیمت : دس روپے

کتابت : منظور الدین ۔ ٹیا محل دہلی

ٹائیٹل : قیصر سرمست

(مطبوعہ جمال پریس دہلی)

ملنے کے پتے :

۱۔ مڑیہ آشرم، راگھوماجرہ ۔ پٹیالہ

۲۔ نازش بک سینٹر معرفت ماہنامہ تحریک ۔ دریا گنج دہلی

۳۔ رشی پٹیالوی E-71 آنند نکیتن ، موتی باغ 2 ۔ نئی دلّی

---

یہ مجموعہ محکمہ السنہ پنجاب کے مالی اشتراک سے شائع ہوا

# ترتیب

# اِنتساب

نئے ادبی رجحانات کے نام

جناب نوبہار صابر کی شخصیت اور شاعری دونوں سے میرا تعارف برسوں پرانا ہے۔ وہ ایک پختہ کار شاعر ہیں اور تقسیم کے بعد پنجاب کی سرزمین سے ابھرنے والے کئی نوجوان شاعروں نے اپنا ذہنی سفر ان کی رہنمائی میں طے کیا ہے۔ صابر صاحب شاعری کی متعدد اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں اور ہر صنف میں انھوں نے اپنی قدرتِ کلام ثابت کر دکھائی ہے۔ وہ شاعری میں موضوعات کی تجدید کے بھی کبھی قائل نہیں رہے۔ زیرِ نظر مجموعہ سے پہلے اُن کے کلام کے جو مجموعے شائع ہوئے ہیں وہ اس گواہی کے لئے کافی ہیں کہ ان کا ذہنی افق کتنا وسیع اور ان کے فکر و خیال کا دائرہ کتنا پھیلا ہوا ہے۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی جو اُن کی تازہ غزلوں پر مشتمل ہے، تنوع اور تازگی کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، صابر صاحب ایک پختہ کار اور پختہ مشق شاعر ہیں پختہ مشقی کی اس منزل پر پہنچ کر، جہاں وہ کھڑے ہیں، شاعر بالعموم خود کو دہرانے لگتا ہے اور نئے اکتسابات کی طرف اس کا ذہن متوجہ نہیں ہوتا لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ " زرد پتّے " کے مطالعے کے بعد صابر صاحب کے بارے میں آپ کا تاثر بالکل مختلف ہوگا۔ اپنی ان غزلوں میں احساس کی سطح پر بھی اور اظہار کی سطح پر بھی وہ اس حد تک نئے ہو کر سامنے آئے ہیں کہ ان کے ہم عصروں کی صف میں انھیں کھڑا کر کے ان کی شناخت شاید مشکل ہو جائے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ میں یہ کہہ رہا

ہوں کہ انھوں نے اس روایت سے اپنا رشتہ توڑ لیا ہے جسے صدیوں کے تسلسل نے اعتبار کی سند بخشی ہے۔ لفظوں کی مزاج شناسی اور زبان کا جو رچاؤ ان کے ہاں نظر آتا ہے وہ اسی روایت سے آگاہی اور اس کے مثبت پہلوؤں کی پاسداری کی دین ہے لیکن خوشی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ انھوں نے اس دین ہی کو سب کچھ نہیں سمجھ لیا اور اپنے عہد کے فنی معیاروں تک رسائی کی کامیاب کوشش کی۔

صابر صاحب کا عہد جسے ہم اپنا عہد بھی کہہ سکتے ہیں زندگی اور ادب دونوں میں دور رس تبدیلیوں کا عہد ہے۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں وہ تہذیبی قدریں جن سے ہم مانوس تھے ہمارے لئے اجنبی ہو کر رہ گئی ہیں اور سماجی روابط کی جو عمارت ان قدروں کی بنیاد پر قائم تھی اس کی حیثیت ایک کھنڈر سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے۔ اس کھنڈر میں کھڑا ہوا تنہا انسان ان اجتماعی بشارتوں پر ایمان نہیں لا سکتا جو اس کے خوش عقیدہ پُرکھوں نے اسے کبھی سنائی تھیں۔ اسے اپنا مستقبل خلاؤں میں تلاش کرنا ہے اور تلاش و تجسس کے اس سفر کی ابتدا جس کی ابھی کوئی سمت متعین نہیں، خود اپنی ذات سے کرنی ہے۔ خود شناسی کا مرحلہ اس سفر کا پہلا پڑاؤ ہوگا اور کائنات شناسی کی نئی منزلوں کی طرف سارے راستے یہیں سے جائیں گے۔ صابر صاحب خود اس سفر کی ہولناکیوں سے دوچار ہو چکے ہیں کہ نہیں، میں نہیں جانتا لیکن ان کے اشعار میں اس انجانے سفر پر نکل چلنے والے قدموں کی آہٹیں جا بجا سنائی دیتی ہیں ؎

آج تو دل بھی دھڑکتا ہے تو ڈر جاتا ہوں میں
زندگی میں اس سے پہلے اتنا سناٹا نہ تھا

تیرگی بھی ہے ایک منظر، دیکھ    سُن، کہ سناٹا بولتا ہے یہاں
جانے طے کب ہو یہ سفر صابرؔ    خود سے ملنے کا مرحلہ ہے یہاں

یہ حادثہ ہے، جو کل تک چراغِ منزل تھا
وہ آج راہ کا پتھر دکھائی دینے لگا
یہ کوئی خواب ہے، یا ذاتِ آگہی صابرؔ
میں اپنے جسم سے باہر دکھائی دینے لگا

کبھی شبنم کی لطافت، کبھی شعلے کی لپک
لمحہ لمحہ یہ بدلتا ہوا کیا ہے مجھ میں؟

اپنے داخلی وجود کی یہ تلاش یہ تجسّس اگر ذات سے کائنات کی طرف لے جائے تو قلب و نگاہ کو نئی وسعتوں سے بھی آشنا کرتے ہیں اور زندگی کے غیر آباد علاقوں میں نئی آبادیاں بسانے کا حوصلہ بھی بخشتے ہیں، لیکن معاملہ اس کے برعکس ہو تو سارے امکانات انانیت کی تنگ گپھا میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں اور اس تنگ و تاریک گپھا کی حبس زدہ فضا میں طرح طرح کے روحانی عوارض کی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ان عوارض میں سب سے بڑا عارضہ خود غرضی کا وہ رویّہ ہے جو موجودہ دنیا کی بہت سی مصیبتوں کا ذمّہ دار ہے۔ صابرؔ صاحب اِس خطرے سے خبردار ہیں اور ہمیں بھی متنبّہ کر رہے ہیں ؂

پھیلی ہوئی تھی دشتِ خودی میں اَنا کی دھوپ
خود سے پرے نگاہ کو کچھ سوجھتا نہ تھا

جاتا کہاں کہ آگے کوئی راستہ نہ تھا
اندھی گپھا میں میری انا لے گئی مجھے

در آئے کس طرف سے اُجالا، کہ چار سُو
دشتِ انا میں چھاؤنی ڈالے پڑی ہے رات

ذات کی کھوہ سے نکلیں تو کریں سیرِ جہاں
دشت سے پنڈ چھڑائیں تو سمندر دیکھیں

ان دیکھے البیلے منظر دیدہ و دل کو دعوت دیں
اپنے گھر کی دیواروں سے اُونچا اُٹھ کر دیکھو تم

دے کے دستک دیکھنا واپس نہ ہو جائے کہیں
اک کرن باہر کھڑی ہے اُٹھ کے کھڑکی کھولیئے

زندگی کی بے اساسی، مسرتوں کی گریز پائی، خوش آئند امیدوں کی بدانجامی اور خوبصورت خوابوں کی حسرتناک شکست، یہ وہ تلخیاں ہیں جن کا ذائقہ ہر دور کے حسّاس انسانوں کو چکھنا پڑا ہے لیکن اگلے وقتوں میں زندگی بسر کرنے کا ایک انداز تھا، کوئی روحانی طاقت تھی جو اِن تلخیوں کو گوارا بنا دیا کرتی تھی۔ وقت جسے اِن صبر آزما تلخیوں کا جنم داتا کہنا چاہیئے، ابتدا ہی سے خودسری کا خوگر سہی مگر شاید اتنا بے قابو، اتنا بے مہار، اتنا تند رفتار کبھی نہ رہا ہو جتنا آج ہے۔ وقت کی اس تند رفتاری نے انسان کو بے حوصلہ کر دیا ہے اور اپنے بکھرتے ہوئے وجود

کو سمیٹ سکنے کی تھوڑی بہت سکت جو اُس میں تھی وہ بھی اس سے چھین لی ہے۔ بے بسی اور بے چارگی کے اس مرحلے میں یہ قدرتی ہے کہ اپنی بے مائگی اور شکست انجامی کا وہ تلخ احساس جو انسانی سرشت میں ہمیشہ سے شامل ہے زیادہ شدت اختیار کر لے اور بار بار اس کے گھائل دل و دماغ پر کچوکے لگائے۔ نوبہار صابر صاحب کے یہ شعر دیکھئے اور اس خنجر بکف احساس سے ایک بار اور ملاقات کیجئے :۔

اک رات میں یہ پیڑ ہوا کیسے بے لباس — کل تک تو اس کا ایک بھی پتّا جھڑا نہ تھا

گھوم لینے دو چمن میں آج مثلِ برگِ خشک
کل زمانے کی ہوا جانے کدھر کو لے اُڑے

رات کی یادوں کے ماتھے پر پسینہ آگیا — صبح کو جب دھوپ بن کر سر پہ چھائی چاندنی

ساحل سے میرا پاؤں پھسلنے کی دیر تھی — اِک موجِ بے پناہ بہا لے گئی مجھے

بیٹھا تھا چھُپ کے اوس کی ٹھنڈی پھوار میں
آئی کڑکتی دھوپ اُٹھا لے گئی مجھے

کس گھاٹ جا لگیں وہ سماعت کی کشتیاں — کس دشت میں صدا کا سمندر اُتر گیا

جو کل زلزلے میں کھنڈر ہو گئے — مرا گھر انہی خواب زاروں میں تھا

بابا! ہم یہ کس نگری میں آ پہنچے کشکول لئے
ہر دروازہ بول رہا ہے اور کوئی گھر دیکھو تم

گھر آتے آتے الم میں بدل گئی صابرؔ          خوشی خرید کے لایا تھا اک دکان سے میں

اس کو زخم ملے دنیا میں، جس نے مانگے تازہ پھول،
جس نے چاہی چھاؤں کی چھتری اسکے سر پر چھائی دھوپ

بھاگتی بھیڑ نے جانے کسے پامال کیا          چیخ کر کوئی پکارا تھا بچالو مجھ کو

وقت کی اس قہرناکی سے بچ نکلنے کی بے اساس خواہش نے اکثر ماضی کی طرف مراجعت کی راہ سجھائی ہے۔ دھند میں پٹا ہوا ایک دور افتادہ جزیرہ جس کی کشش ان کے لئے مسلّم ہے جو سمندر کی طوفانی لہروں کے تھپیڑے کھاتی بوسیدہ کشتی میں سوار ہوں۔ یہ جزیرہ انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے، انھیں دلاسا دیتا ہے اور گہری دھند میں پرانی یادوں کی طرح چمکتے ہوئے کچھ آثار جو اس جزیرے پر اب بھی قائم ہیں، ان میں ایک داخلی استحکام کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ ماضی کی عطا کردہ یہ داخلی توانائی کتنی ہی موہوم سہی، وقت کی چیرہ دستیوں اور حال، کی ناہمواریوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے جس اخلاقی حِس کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا سرچشمہ یہی ہے۔ نوبہار صابرؔ بھی حال کی سنگینی سے گھبرا کر ماضی کی رنگینی کی طرف پلٹتے ہیں لیکن وہاں سے واپسی پر، جو ناگزیر ہے، وہ خستگی کی نہیں توانائی کی سوغات ساتھ لاتے ہیں اور اسے مستقبل کے ہاتھوں تک پہنچا دینے کا عزم بھی۔ یہ ان کے شاعرانہ کردار کا وہ وصف ہے جو اُن کے حزنیہ لہجے کو بھی ایک رجائی آہنگ دے دیتا ہے۔ ان کا پورا کلام میرے اس قول کی تائید کرتا نظر آئے گا لیکن سرِ دست یہ چند شعر دیکھئے:

آج اک بدلی برس کر دل میں جل تھل کر گئی
ورنہ اِس ڈھلوان پر پانی کبھی ٹھہرا نہ تھا

بے شک ہوا سے کچھ نہ ملے دھول کے سِوا
خوشبو کی طرح خود کو یہاں بانٹتے چلیں

جدھر نگاہ کریں رنگ و نور کا عالم
ترا خیال بھی ہے تیری انجمن کی طرح

آئی ہے تو کیا یہیں آکر بسر جائے گی رات
راہ چلتی اک مسافر ہے گزر جائے گی رات
اک ذرا ہے بارشِ سنگِ سحر ہونے کی دیر
دیکھتے ہی دیکھتے یارو بکھر جائے گی رات

نسیمِ صبح ستم ڈھا گئی بجھا کے اُسے
ابھی دیئے میں بہت ولولہ تھا جلنے کا

لمسِ تیشہ کو ترستا ہوا اک سنگ ہوں میں
بُت گرو! آؤ کسی شکل میں ڈھالو مجھ کو
شبِ تاریک کا پُرہَولِ سفر ہے صابر
شمعِ منزل ہوں، سرِ راہ جلالو مجھ کو

نہ مُڑ کے گھاٹ کی جانب بہاؤ میں دیکھا
عجیب حوصلہ کاغذ کی ناؤ میں دیکھا

یہ کچھ غالب میلانات تھے جو مجھے نوبہار صابر صاحب کے کلام میں نظر آئے اور میں نے ان کی نشاندہی کی کوشش کی ورنہ جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ صابر صاحب کے کلام میں وہی بوقلمونی اور رنگا رنگی ہے جو زندگی کا خاصّہ ہے۔ وہ چند رجحانات و میلانات کے اسیر نہیں۔ انھوں نے زندگی کو اس کے ہر رنگ میں جن میں حسن وعشق کا سدا بہار رنگ بھی شامل ہے، دیکھنے کی آرزو کی ہے اور ان کا کلام اسی آرزومندی کی تفسیر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے

اظہار کی سطح پر نوبہار صابر صاحب نے تشبیہ اور استعارے سے بہ طور خاص کام لیا ہے۔ ان کی تشبیہات جمالیاتی کیفیات کی حامل ہیں اور ہر موقع پر ایک خوبصورت ذہنی فضا کی تخلیق کرتی ہیں۔ استعارہ سازی کے عمل میں وہ قرائن کو بہت ملحوظ رکھتے ہیں اور یہی سلیقہ ان کے ہاں علامتوں کے استعمال میں بھی نظر آتا ہے۔

نوبہار صابر صاحب کے کلام کے خارجی اوصاف میں سے ایک وصف بعض انگریزی الفاظ کا بے تکلّف مگر برمحل استعمال ہے جو ہمارے موجودہ معاشرتی ماحول کے حوالے سے اپنا جواز مکمل طور پر ثابت کر دیتا ہے۔ کہیں کہیں 'پنجابیت' بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ یہاں اس لفظ کو میں ان معنی میں استعمال نہیں کر رہا ہوں جن معنی میں بطور تحقیر کبھی حضرات دہلی و لکھنؤ استعمال کیا کرتے تھے، میرا اشارہ اس مزاجی کیفیت کی طرف ہے جس میں ایک قلندرانہ شان بھی ہے اور ایک کھلنڈرے پن کا انداز بھی۔ یہ کیفیت اپنے اظہار کے لئے جن لفظوں کی متقاضی تھی، صابر صاحب نے ان کے انتخاب میں کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے

دہلی

۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء

مخمور سعیدی

# تعارف و تعلّق

جناب نو بہار صابر سے میرا تعلّق چالیس سالہ پُرانا ہے۔ اِس طویل مدّت میں جو دس برس کم نصف صدی کے شب و روز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، ہم دونوں، بقولِ شخصے "یک جان دو قالب" رہے ہیں۔ حلقۂ احباب میں ہماری رفاقت 'مثالی یگانگت' کے زُمرے میں شمار ہوتی ہے۔

جہاں تک ان کی شاعرانہ حیثیت کا سوال ہے، میری دانست میں وہ خطّۂ پنجاب میں، صفِ اوّل کے شاعر ہیں۔ ذاتی مطالعہ اور مُسلسل ریاض کے سہارے انھوں نے بے امدادِ غیرے میدانِ شعر و سُخن میں ایسا افضل و برتر رُتبہ حاصل کیا ہے جسے اساتذہ کا مقام و مرتبہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

چونکہ فطرتاً وہ بے حد حلیم الطبع، منکسرُ المزاج، کم گو اور نہایت کم آمیز واقع ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو منوایا نہیں بلکہ اہلِ نظر نے انھیں پہچانا اور مانا ہے۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور ان کا خدا داد ذوقِ سلیم قابلِ رشک حد تک منفرد ممتاز اور معتبر ہے۔ جمالیاتی ادبی شعور و آگہی اور فوائدِ زبان و بیان سے وابستگی نے ان کی طبعِ رواں کو فصاحت و بلاغت اور لطافت و نفاست کے ایسے جوہر عطا کئے ہیں جن کی آب و تاب جا بہ جا ان کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ اُن کی تخلیقات میں کہیں بھی ابتذالِ خیالات اور رکاکتِ احساسات کا شائبہ نہیں۔ ان کے اسلوبِ بیان میں وارداتِ قلبی کی صحیح عکاسی کا رنگ نمایاں ہے۔

جہاں تک ان کی ذاتِ والاصفات کا تعلّق ہے وہ ایک فرشتہ سیرت، محبّت نواز، بلند نظر اور فراخ دل انسان ہیں۔ ان کی فطرت اخوّت و مروّت، راست روی اور حق گوئی کے تابناک جواہر سے مرصّع و آراستہ ہے۔ اُن کی ادبی خدمت ہر قسم کی نمود و نمائش سے بے نیاز ہے۔ انھوں نے کبھی کسی کے کلام پر حرف گیری نہیں کی اور نہ کسی کی ذات میں عیوب کی نشاندہی کی۔ اُن کی رنگین بیانی اور مضمون آفرینی کو قدیم و جدید ہر رنگ کے مشاہیر نے قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ غرضکہ وہ بہ حیثیت شاعر و ادیب آپ اپنا جواب ہیں۔

اُن کی دوست داری کی سب سے بڑی خُوبی یہ ہے کہ ان کے دائرۂ تعلّق میں آنے والا ہر شخص انھیں اپنا ہم دم و ہم جلیس، دیرینہ دوست اور پُرانا درد آشنا تصوّر کرتا ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ وہ صرف اُسی کے ہیں۔ یہی ان کے حُسنِ سلوک کی نمایاں خُوبی ہے کہ ہر محفل میں ہر کوئی انھیں احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔

ذاتی طور پر ان سے اپنے قلبی لگاؤ کو میں نے ہمیشہ متاعِ جاں کی طرح عزیز سمجھا ہے۔ مجھے اُن کی نیاز مندی پر ہمیشہ فخر رہا ہے اور انشاء اللہ تاحیات رہیگا۔

رشی پٹیالوی

۵ دسمبر ۱۹۷۷ء

# حرفِ آغاز

لڑائی میں کام آئے

مُردہ سپاہیوں کی طرح

جو بکھرے پڑے ہیں صحنِ چمن میں ہر سُو

یہ زرد پتّے نہیں ہیں

مرے شکستہ خوابوں کا کارواں ہے

سرابِ زارِ حیات میں جن کو

تشنہ کامی نے مار ڈالا

دیکھئے صابرؔ غزل کی جامہ زیبی کا کمال

ہر نئی پوشاک میں جچتی ہے یہ کافر ادا

○

ٹوٹتا ہوں کبھی جُڑتا ہوں مَیں
جاگتی آنکھ کا سپنا ہوں مَیں

اپنی صُورت کو ترستا ہوں مَیں
آئنہ ڈھونڈنے نِکلا ہوں مَیں

کبھی پِنہاں کبھی پیدا ہوں مَیں
کِس فسوں گر کا تماشا ہوں مَیں

خلشِ خار کبھی نکہتِ گُل
ہر نفس رنگ بدلتا ہوں مَیں

دیکھئے کِس کی نظر پڑتی ہے
کب سے شوکیس میں رکّھا ہوں مَیں

کوئی تریاق نہیں میرا علاج
کُشتۂ زہرِ تمنّا ہوں مَیں

کبھی اُٹھتے ہیں مرے دام بہت
کبھی بے مول بھی مہنگا ہوں مَیں

کوئی پہچانے تو کیا پہچانے
کبھی صُورت کبھی سایا ہوں مَیں

آتشِ غم کی تمازت کے نثار
جتنا تپتا ہوں نکھرتا ہوں مَیں

کوئی جادہ ہے نہ منزل صابرؔ
اپنے ہی گِرد بھٹکتا ہوں مَیں

○

ڈور کے جلووں کی شادابی کا دلدادہ نہ ہو

تُو جسے دریا سمجھتا ہے کہیں صحرا نہ ہو

آئینے کو ایک مُدّت ہو گئی دیکھے ہوئے

وہ جبینِ شوق جس پر سوچ کا سایہ نہ ہو

وہ بھی میرے پاس سے گذرا اِسی انداز سے

مَیں نے بھی ظاہر کیا جیسے اُسے دیکھا نہ ہو

اُس طرف کیا طُرفہ عالم ہے یہ کُھل سکتا نہیں

آدمی کا قد اگر دیوار سے اونچا نہ ہو

مصلحت چاہے رہوں ڈالے تصنّع کا نقاب

دوستی کی مانگ چہرے پر کوئی پردہ نہ ہو

دھوپ سے گھبرا کے بیٹھا تو ہے لیکن دیکھ لے

یہ کسی گرتی ہوئی دیوار کا سایہ نہ ہو

قہقہوں کی چھاؤں میں اک شخص بیٹھا ہے اُداس

وہ بھی میری ہی طرح اس بھیڑ میں تنہا نہ ہو

صابرؔ! ان مانوس گاہوں سے تو دل اُکتا گیا

آ چلیں اُس شہر میں پہلے جسے دیکھا نہ ہو

○

کہاں سے آج نئی یاد کی ہوا آئی

فضا میں بس گئی خوشبو ترے بدن کی سی

○

جب سُخن موجِ تخیّل سے رَوانی مانگے
مجھ سے ہر لفظ نئی رُوحِ معانی مانگے

دل وہ دیوانہ کہ دریا سے تو پیاسا لوٹے
سامنے موجِ سراب آئے تو پانی مانگے

حافظہ ذہن کا دَر بند کئے بیٹھا ہے
دل بہلنے کو کوئی یاد پُرانی مانگے

حُسن سَر تا بہ قدم طُرفہ اَدائی چاہے
عشق تا حدِّ یقیں سادہ گُمانی مانگے

آئینہ دیکھوں تو صابر یہ گُماں ہوتا ہے
عکس مجھ سے وہ خط و خالِ جوانی مانگے

○

آج سے پہلے بھی یوں تو ہیں اسے بھولا نہ تھا
اتنی شدّت سے کبھی وہ یاد بھی آیا نہ تھا

آج اِک بَدلی برس کر دل میں جل تھل کر گئی
ورنہ اِس ڈھلوان پر پانی کبھی ٹھہرا نہ تھا

کیوں پڑا رہتا مَیں اب تک پتھّروں کے ڈھیر میں
جوہری تجھ سا کوئی اس راہ سے گذرا نہ تھا

قافلہ سوچوں کا چلتا تھا ہمیشہ ساتھ ساتھ
رہگذارِ زندگی پر میں کبھی تنہا نہ تھا

آج تو دل بھی دھڑکتا ہے تو ڈر جاتا ہوں مَیں
زندگی میں اس سے پہلے اِتنا سنّاٹا نہ تھا

آج صابر دل کے آنگن میں یہ کیسی روشنی ؟
اِس کھنڈر میں تو دِیا جلتے کبھی دیکھا نہ تھا

○

یہ ایک ابر کا ٹکڑا برس گیا بھی تو کیا؟
کہ زندگی میں تپش ہے سُلگتے بَن کی سی

گُدازِ عشق سے ہوتی ہے شعر میں پیدا
وہ جس کو آنچ کہیں میر کے سخُن کی سی

○

آئینہ میرے سامنے جب تک ہُوا نہ تھا
میری نظر میں مجھ سا کوئی دوسرا نہ تھا

اِس قُربِ انفعال گزیدہ کو کیا کہیں
وہ ساتھ چل رہا تھا مگر بولتا نہ تھا

اُس شہرِ بے لحاظ میں سب خُود پرست تھے
دُکھ درد دوسروں کے کوئی بانٹتا نہ تھا

ہر راہ گیر اپنی لگن میں تھا گرم رَو
جانا ہے کس طرف یہ کوئی جانتا نہ تھا

اِک رات میں یہ پیڑ ہُوا کیسے بے لباس؟
کل تک تو اس کا ایک بھی پتّا جھڑا نہ تھا

پھیلی ہوئی تھی دشتِ خودی میں اَنا کی دُھوپ
خود سے پرے نگاہ کو کچھ سُوجھتا نہ تھا

یوں تیرے بعد اجنبی لگتے ہیں بام و دَر
جیسے میں اپنے گھر سے کبھی آشنا نہ تھا

آنے لگی ہے سایۂ دیوار سے بھی آنچ
اِس درجہ گرم تو کبھی سُورج ہُوا نہ تھا

صابرؔ کو جب سُنا تو ہوئے دل سے معترف
یہ شخص دیکھنے میں تو ہم کو جچا نہ تھا

○

سمجھ کے سنگِ گراں کر نہ پاش پاش اُسے
تو شیشہ گر ہے تو مثلِ نگیں تراش اُسے

ریاضِ کون و مکاں میں بھٹک نہ اُس کے لئے
تُو اپنی ذات کے صحرا میں کر تلاش اُسے

اب اُس کے واسطے کوئی کشش چمن میں نہیں
کہ راس آ گئی صحرا کی بُود و باش اُسے

اب اپنے عکسِ شکستہ کو دیکھ کر نہ بگڑ
وہ آئنہ تھا تو رکھنا تھا بے خراش اُسے

متاعِ درد کو رکھ دل میں راز کی صورت
ہنسی اُڑے گی زمانے پہ کر نہ فاش اُسے

جو تجھ کو چھوڑ گیا کر نہ انتظار اُس کا
گذر گیا ہے جو لمحہ نہ کر تلاش اُسے

پُرانا یار ہے دیکھ آئیں چل کے صابر کو
کبھی سے سُنتے ہیں ہم صاحبِ فراش اُسے

○

آئنے کتنے تھے لیکن ساخت اِک جیسی نہ تھی
میں کہیں باون گزا تھا اور کہیں بالشتیا

○

سر دجب تک نہ ہوا لاؤ میاں!
کوئی قصہ سُنو، سُناؤ میاں!

بیتی باتوں کو بھُول جاؤ میاں!
جان کو روگ کیوں لگاؤ میاں!

بے گہر ہو صدف تو کچھ بھی نہیں
ظاہری حُسن پر نہ جاؤ میاں!

کھِل اُٹھے گی دھنک کہیں نہ کہیں
پہلے کھُل کر برس تو جاؤ میاں!

آج اس نے مجھے نہ پہچانا
اِک ذرا آئنہ تو لاؤ میاں!

زندگی بے مزا لگے صاحب
کوئی تازہ فریب کھاؤ میاں!

○

یہ اندھیرا ہے رُوح کا بابا! خونِ دل سے دِیا جلا بابا!

کوئی دروازہ کُھل ہی جائے گا تو لگا تو سہی صدا بابا!

پھر پہننا یہ گیروا چولا پہلے کر من کو جوگیا بابا!

خواہشوں کے سراب زاروں میں جو مسافر گیا، گیا بابا!

ورنہ دنیا کا تیاگ لاحاصل آپ اپنے سے ہو جُدا بابا!

باٹ جنموں چلے مگر ہے وہی خُود سے خود تک کا فاصلا بابا!

زندگی زہر ہی سہی صابر

اِس سے ہم جی چُرائیں، نا بابا!

○

صدیوں سے مقفّل ہے گھر تازہ ہوا مانگے
کھڑکی کو کھُلا چاہے دروازے کو وَا مانگے

دل سایۂ گیسو میں سونے کی دُعا مانگے
جلتا ہوا ریگستاں گھنگھور گھٹا مانگے

معصوم تمنّا کی کیسے ہو خوشی پُوری
ہم دشت نوردوں سے پھُولوں کی قبا مانگے

ضامن تھا جو طوفاں میں کشتی کی حفاظت کا
وہ ڈوبنے والوں سے ساحل کا پتا مانگے

خواہش کا بھکاری بھی کس درجہ ندیدہ ہے
جو کچھ اِسے دیتے ہیں یہ اُس سے سِوا مانگے

صابر! دلِ ناداں کی مُعجز طلبی دیکھو
خوشبُو مہ و انجم سے، پھولوں سے ضیا مانگے

○

چڑھتے سوُرج سے عبث برسرِ پیکار تھا وہ
ہو گیا ڈھیر کہ نم ریت کی دیوار تھا وہ

جب پڑا رَن تو کھُلا اس کی شجاعت کا بھرم
مخملیں خول میں اِک کاٹھ کی تلوار تھا وہ

طُرفہ اَن دیکھے مناظر کی کشش تھی صابر
ایک ہی جست میں دیوار کے اُس پار تھا وہ

○

جنّتِ غازہ سے کِس درجہ بدل جاتے ہیں لوگ
دیکھنے والوں کو کیا سے کیا نظر آتے ہیں لوگ

شہر میں جب کوئی آجاتا ہے آئینہ بدست
پتّھروں سے جھولیاں بھر کر نکل آتے ہیں لوگ

نشّۂ مے ہی نہیں کچھ قاطعِ ادراک و ہوش
نشّۂ افراطِ زر سے بھی بہک جاتے ہیں لوگ

اپنے چہرے مسخ ہونے پر تو شرماتے نہیں
دوسروں کے خال و خد پر طعنہ فرماتے ہیں لوگ

بیشیٔ دانش بھی ہے دیوانگی کا اِک سبب
روشنی حد سے زیادہ ہو تو چُندھیاتے ہیں لوگ

اِس سے بہتر زندگی کی اور کیا تفسیر ہو
ریت کی دیوار کے سائے میں سستاتے ہیں لوگ

کل جسے کوئے ملامت میں کیا تھا سنگسار
آج اُس کی لاش پر کیوں پھول برساتے ہیں لوگ؟

چلتے چلتے راہ میں صابر جسے لغزش ہوئی
روند کر اُس پا شکستہ کو نکل جاتے ہیں لوگ

○

پُرفسوں سائے گھنیری شام کے — آچلیں بازو میں بازو تھام کے
چُپکے چُپکے سسکیاں لیتا ہے کون؟ — شب کے سنّاٹے کا دامن تھام کے
زندگی گرتی ہوئی دیوار ہے — کون رکھے اِس کو صابر تھام کے

○

کانٹے کو پھول، سنگ کو گوہر کہا گیا
اِس شہر میں گدا کو سکندر کہا گیا

بے چہرہ لوگ حُسن کا معیّار بن گئے
پرچھائیوں کو نُور کا پیکر کہا گیا

جلّاد کو مسیحا نفس کی سند مِلی
انسان دشمنوں کو پیمبر کہا گیا

کچھ جس کے پاس نیش و نمک کے سِوا نہ تھا
چاکِ جگر کا اُس کو رفوگر کہا گیا

کیا شئے ہے مصلحت بھی شبِ تیرہ فام کو
دانشوروں میں صبحِ منوّر کہا گیا

گونگا ہے کر رہا ہے اشاروں میں بات چیت
صابرؔ کو کس بنا پہ سخنور کہا گیا

○

ہار جیت تو بنی ہوئی ہے اِسکی چِنتا چھوڑو تُم

جیون ہے چوسر کی بازی ہنستے ہنستے کھیلو تُم

راز کی بات اگر کہنا ہے پاس مرے آ بیٹھو تُم

دیواریں بھی سُن لیتی ہیں دھیرے دھیرے بولو تُم

اَن دیکھے البیلے منظر دیدہ و دل کو دعوت دیں

اپنے گھر کی دیواروں سے اُونچا اُٹھ کر دیکھو تُم

بابا! ہم یہ کس نگری میں آپہنچے کشکول لئے؟

ہر دروازہ بول رہا ہے" اور کوئی گھر دیکھو تم"

دھوپ چڑھے ہر خال و خط کا بھید بھرم کُھل جائیگا

اچھّا ہے یہ دلکش منظر دُھند میں لِپٹا دیکھو تم

پتّھر بن کر رہ جاؤ گے یادوں کے ویرانے میں
پیچھا کرتی آوازوں کی سمت نہ مڑ کر دیکھو تُم

اِس بستی میں سب بنجارے کوئی نہ دے مُنہ مانگے دام
صابرؔ اپنا مہنگا سودا اور کہیں جا بیچو تُم

○

کہیں ضرور لُٹے ہیں یہ قافلے والے
پلٹ پلٹ کے جو یوں رہگذر کو دیکھتے ہیں

شعورِ دید بھی لازم ہے ذوقِ دید کے ساتھ
کہ اہلِ حُسن بھی اہلِ نظر کو دیکھتے ہیں

بسی ہوئی ہے نگاہوں میں جن کی منزلِ شوق
وہ کب جمالِ سرِ رہگذر کو دیکھتے ہیں

○

رنگِ گلاب بُوئے سمن کون لے گیا
صحنِ چمن سے حُسنِ چمن کون لے گیا

سایا تو سامنے ہے مگر خود کہیں نہیں
یارب اُس آدمی کا بدن کون لے گیا

بیٹھے ہیں انجمن میں سبھی بُت بنے ہوئے
اہلِ نوا سے حرف و سخن کون لے گیا

صد پیکرِ حسیں ہیں اسیرِ حصارِ سنگ
صورت گروں سے تیشۂ فن کون لے گیا

بیتی رُتوں کے زرد رُو پتّوں کو چھوڑ کے
نورُستہ کونپلوں کی پھبن کون لے گیا

دیکھو یہ کس کی لاش کھُلی قبر کے قریب
عُریاں پڑی ہوئی ہے کفن کون لے گیا

اک بیکراں خلا کا اندھیرا ہے اور مَیں
دَھرتی تو خود تجی تھی گگن کون لے گیا

صابرؔ سبھی کے پیشِ نظر ہے مفادِ ذات
اہلِ وطن سے حُبِّ وطن کون لے گیا

○

رونے والوں پر یہ دُنیا ہنستی ہے
ہنسنے والوں پر آوازے کستی ہے

○

نہ مُڑ کے گھاٹ کی جانب بہاؤ میں دیکھا
عجیب حوصلہ کاغذ کی ناؤ میں دیکھا

کسی سے 'لاگ'، کسی سے لگاؤ میں دیکھا
اسیر سب کو اسی بھید بھاؤ میں دیکھا

بگڑ کے مجھ سے الگ بھی ہوا وہ رویا بھی
یہ طُرفہ رنگ بھی اُس کے سُبھاؤ میں دیکھا

سُکھوں کی راہ گذر پر جو رابطے ٹوٹے
بحال اُن کو دُکھوں کے پڑاؤ میں دیکھا

نفس نفس تھا دھوئیں کی لپیٹ میں صابر
بدن بدن کو دہکتے الاؤ میں دیکھا

○

ہو کوئی طُرفہ جمالی تو مکرّر دیکھیں
ورنہ کِس بات پہ دیکھا ہُوا منظر دیکھیں

کیوں ہتھیلی کی لکیروں میں مقدّر دیکھیں
جو دِکھاتا ہے شب و روز کا چکّر دیکھیں

آپ کیا جانیں گھنی چھاؤں کی قدر و قیمت
اِک ذرا دُور کڑی دھوپ میں چل کر دیکھیں

بس نادیدہ حوادث سے ہے لمحوں کی سپاہ
ہم پہ کب وار کرے وقت کا لشکر دیکھیں

ذات کی کھوہ سے نکلیں تو کریں سیرِ جہاں
دشت سے پنڈ چھڑائیں تو سمندر دیکھیں

ذہن کے پٹ پہ اُبھرتے ہیں گئی رُت کے نقوش
نیند میں جیسے کوئی خواب کا منظر دیکھیں

فرق کچھ اپنے پرائے میں نہیں ہے صابر
زاویہ اپنی نگاہوں کا بدل کر دیکھیں

○

اُنھیں پہ کھُلتے ہیں کم راحتوں کے دروازے
جو راحتوں کی تمنّا زیادہ رکھتے ہیں

نہ جیب ہے نہ گریباں نہ پیرہن باقی
اب اہلِ جذب و جُنوں کیا ارادہ رکھتے ہیں

نہ لعل ہیں نہ گہر صابر اپنے دامن میں
بس ایک دل ہے جو کافی کُشادہ رکھتے ہیں

○

جب سے پکّی سڑک بن گئی گاؤں میں

آ بسی شہر کی چھوکری گاؤں میں

الاماں! کس قیامت کا بھونچال تھا

جھونپڑی اِک نہ سالِم بچی گاؤں میں

دل گنواروں کے تاریک ہوتے گئے

جتنی بڑھتی گئی روشنی گاؤں میں

گردِ حالات میں چھُپ گئے خال و خد

چہرا چہرا ہُوا اجنبی گاؤں میں

سنگپاروں کی آنکھوں میں چُبھنے لگی

اب تو شیشوں کی ہمسائیگی گاؤں میں

جب سے میلوں تماشوں کا موسم گیا
کھُل کے مِلتی نہیں زندگی گاؤں میں

شہر جس کی کدورت سے بدنام تھے
اب وہی خاک اُڑنے لگی گاؤں میں

چُپ ہے چوپال پنگھٹ بھی ہے بے صدا
پھر گئی کون سی دیونی گاؤں میں

جب الاؤ کے شعلے ضیا پوش تھے
کیا فضا تھی الف لیلوی گاؤں میں

مسترد ہو گیا بانسری کا چلن
نغمہ زن ہے وِودھ بھارتی گاؤں میں

صابرؔ اب کے تو جاتے ہی مُرجھا گئی
میرے خوابوں کی نازک کلی گاؤں میں

○

ہم کہاں جائیں کہ ہیں بے سر و سامانِ ازل
اور دنیا ہے کہ ہر چیز کی قیمت مانگے

دل تو بچہ ہے کھلونوں سے بہل جاتا ہے
خواب دے کر اسے ٹالو جو حقیقت مانگے

ٹوٹے رشتوں کو بھی رکھ دل میں نگینوں کی طرح
جانے کب آکے کوئی اپنی امانت مانگے

○

گرا پھسل کے جو اک خواب کی چٹان سے مَیں
ہُوا جو حشر بتاؤں وہ کس زبان سے مَیں

جمے نہ پاؤں تو گھبرا گیا اُڑان سے مَیں
پُکارتا ہوں زمیں کو اب آسمان سے مَیں

سمجھ کے رسمِ جہاں سر کٹا دیا آخر
گریز پا رہا برسوں اس امتحان سے مَیں

ورق ورق مرے تن سے لباس اُترتا گیا
کہ حرف حرف کھلا اُس کی داستان سے مَیں

لٹک گئی ہے تڑخ کر کڑی کڑی چھت کی
بس اب وداع لوں اس ٹوٹتے مکان سے مَیں

مری ہی ذات ہوئی ناوک افگنی کا شکار
چلا جو چھوٹ کے احساس کی کمان سے مَیں

گھر آتے آتے الم میں بدل گئی صابر
خوشی خرید کے لایا تھا اِک دُکان سے مَیں

○

ہم بھی کر لیں نمودِ سحر کا یقیں — روشنی ہو اگر روشنی کی طرح
ہاتھ خالی اُٹھے سب ترے ہی بزم سے — تو بھی کنجوس ہے زندگی کی طرح
انجمن انجمن آپ کا ذکر ہے — آج کل کی نئی شاعری کی طرح

○

دل فگاروں کی طرح قسمت کی ہیٹی دوپہر
ایک دن بھی سُکھ کے سائے میں نہ لیٹی دوپہر

لوگ خسخانوں میں 'کُولر' کی ہوا لیتے رہے
ہم نے چادر کی طرح تن پر لپیٹی دوپہر

تیرے غم کی آنچ میں شب بھر بدن جلتا رہا
جیسے بستر پر ہو میرے ساتھ لیٹی دوپہر

چھا گئے بادل تری زُلفِ پریشاں کی طرح
شامِ غم میں ڈھل گئی ہوکر سلیٹی دوپہر

جا بہ جا اس کو بچھا کر دُھوپ تو چلتی بنی
شام نے آکر بصد مُشکل سمیٹی دوپہر

وقت بھی رکتا ہے اپنے پاؤں جب سے راہ میں
کھول کر بیٹھی ہے انگاروں کی پیٹی دوپہر

ہر کرے پر پھرتی ہے صابر کمندیں ڈالتی
یہ جہاں گردِ ازل سورج کی بیٹی دوپہر

○

تمنّاؤں سے بھرتا ہی نہیں دل — سمندر پی کے بھی پیاسا لگے ہے
کبھی اس دل میں کیا کیا رونقیں تھیں — یہ شہر اب ایک ویرانا لگے ہے
شفق ہو ابر ہو یا دھوپ صابر — ہو جی اچھا تو سب اچھا لگے ہے

○

کتنی دل کش کس قدر اندوہ گیں لگتی ہے شام
رُوٹھنے کے 'پوز' میں اک نازنیں لگتی ہے شام

دُھند ہر سُو سایۂ غم کی طرح چھائی ہوئی
سوچ میں ڈوبی ہوئی میری جبیں لگتی ہے شام

اب خیال آیا شفق گُل فام ہے تیری طرح
مَیں بھی سوچُوں آج کیوں اتنی حسیں لگتی ہے شام

ڈوبتے سورج کی ہر رنگیں کرن اِک موجِ خُوں
کُشتگانِ غم کو مقتل کی زمیں لگتی ہے شام

سایۂ گیسو بھی حاصل سایۂ گُل بھی نصیب
آج تو عیشِ دو عالم کی امیں لگتی ہے شام

ریڈیو پر ہو رہا ہے ماتمی دُھن کا الاپ
صابر ایسے میں عجب اندوہ گیں لگتی ہے شام

○

زندگانی دھوپ میں تپتی ہوئی پتھر کی 'بینچ'
آدمی اِس 'بینچ' پر ننگے بدن لیٹا ہُوا

اشرفی جس کو سمجھتے تھے ہم اپنے 'پرس' میں
جھول تھا سونے کا کھوٹی دھات پر پھیرا ہُوا

اُڑ کے جاتا بھی نہیں اور ہاتھ آتا بھی نہیں
آس کا پنچھی ہے اونچی شاخ پر بیٹھا ہُوا

ہو لیا وہ بھی اُچک کر تیز رَو آندھی کے ساتھ
برگِ زرد و خشک تھا جو شاخ سے چمٹا ہُوا

○

آئی ہے تو کیا یہیں آ کر بسر جائے گی رات
راہ چلتی اک مسافر ہے گزر جائے گی رات

اِک ذرا ہے بارشِ سنگِ سحر ہونے کی دیر
دیکھتے ہی دیکھتے یارو بکھر جائے گی رات

زندگی میں جھوٹ سچ کا میل ممکن ہی نہیں
صُبح کی آغوش میں آتے ہی مر جائے گی رات

آئنہ رُو صُبح کا تو رنگ فق ہونا ہی تھا
ہم سیہ بختوں کو دیکھے گی تو ڈر جائے گی رات

لے بہ لے یہ دشتِ تنہائی میں سنّاٹوں کا ڈنک
زہرِ غم بن کر مرے دل میں اُتر جائے گی رات

چاند کا جھومر سجائے آئی ہے خندہ بہ لب

سر برہنہ صبح کو باچشمِ تر جائے گی رات

ہم اُجالوں کے محافظ لے کے قندیلِ حیات

پیچھے پیچھے جائینگے صابرؔ جدھر جائے گی رات

○

جس سے بہارِ لالہ و گُل کو ملے ثبات

اپنے چمن سے ایسی ہوا چاہیئے مجھے

مانوس راستوں کا سفر بھی ہے کچھ سفر

اِک رہگذار سب سے جُدا چاہیئے مجھے

صابرؔ گلِ وجود کا زنداں ہے مجھ پہ تنگ

خوشبو ہوں پھیلنے کو فضا چاہیئے مجھے

○

دستک سُن کر اگوانی کو میں پہنچا دروازے پر
تیز ہوا کا پاگل جھونکا خوب ہنسا دروازے پر

جاتے جاتے آج نہ جانے اُس کے دل میں کیا آئی
پڑھ کر میرے نام کی تختی ٹھہر گیا دروازے پر

صبح ہوئی تو سسکی لے کر دیپ کا شعلہ ڈوب گیا
جانے کس کی چاہ میں ساری رات جلا دروازے پر

یہ کیسی نگری ہے جس کے گھر گھر کی یہ اُلٹی ریت؟
آنگن میں تو نپٹ اندھیرا اُجیارا دروازے پر

چلتے چلتے ٹھہر گئے رہگیر حرارت لینے کو
پٹ کی اوٹ سے لہرایا تھا اِک شعلہ دروازے پر

'بار' میں بیٹھے کنٹر پر کنٹری ڈالے رِندوں نے
'یگ' یگ کے اِک پیاسے نے دم توڑ دیا دروازے پر

صابر جب بھی سوچی ہم نے رنگ محل میں جانے کی
'ہونی' کی لچھمن ریکھا نے روک دیا دروازے پر

○

دُر جو 'شوکیس' میں بکدا نہ لگے　　ہاتھ میں رکھئے تو ویسا نہ لگے

رات دن خاک اُڑاتی ہے ہوا　　دامنِ گُل کبھی میلا نہ لگے

وقت کٹتا نہیں تنہائی میں　　کِس سے ملئے کوئی تجھ سا نہ لگے

○

کبھی دُھندلا، کبھی بھُورا، کبھی کالا بادل
میری فطرت کی طرح رنگ بدلتا بادل

ذہن کی سطح پہ آوارہ تخیّل کی طرح
ڈھونڈتا پھرتا ہے کِس کھیت کا رَستا بادل

دَشت و گلشن پہ تو چھایا رہا چھتری کی طرح
خود کڑی دُھوپ میں جل کر ہُوا کالا بادل

دندناتے ہوئے جھکّڑ کے ہراول سے نہ ڈر
اِسی دستے کے عقب میں ہے سُہانا بادل

دُھوپ جب تلخ حقائق کی ذرا تیز ہوئی
چھُٹ گیا ذہن سے خوابوں کا مچلتا بادل

ایسی بدبخت زمینوں پہ رہا اپنا سفر
جن پہ صدا آبرِ نہ دیکھی ٹوٹ کے برسا بادل

○

مَیں گرد باد سا آوارہ رہ گذار میں تھا
ہوا کا زور بھی شامل مرے غُبار میں تھا

حقیقتوں کے بیابان میں تلاش نہ کر
وہ رنگ و نُور جو خوابوں کے لالہ زار میں تھا

وہیں نہ کھیت رہے ہوں مُجاہدانِ سحر
شبِ سیاہ کا لشکر بھی رہگذار میں تھا

مِلا وہ ٹوٹ کے اور پُر تپاک تھا میں بھی
خلُوصِ شوق نہ اُس کے نہ میرے پیار میں تھا

وداع جب وہ چمن سے ہوئی تو کیا دیکھا
سوائے خاک نہ کچھ دامنِ بہار میں تھا

کوئی بھی سمت نہ تھی اس کی سمتِ شوق کہ وہ
شکستہ پر سا بگولوں کے اختیار میں تھا

کسی کو سمتِ سفر کی خبر نہ تھی صابر
جنُونِ تیز روی سب کو رہگذار میں تھا

○

ہو جب دریوزہ گر بستی کی بستی
کسی کے در پہ دے کوئی صدا کیا؟

بنامِ رنگ و بُو صحنِ چمن میں
ہوس نے دام پھیلائے ہیں کیا کیا؟

سراپردہ ہیں سب اُس انجمن کے
کلیسا کیا، حرم کیا، بُت کدہ کیا؟

○

ہر نفس ایک نیا رُوپ دکھاتی ہے میاں!
اِک عجوبہ سا یہ دنیا نظر آتی ہے میاں!

تم کسی راہ کسی موڑ سے بچ کر نکلو
ہر سڑک شہرِ مکافات کو جاتی ہے میاں!

صرف گلہائے تبسّم ہی نہیں اِس کی عطا
زندگی خون کے آنسو بھی رُلاتی ہے میاں!

مری خوشیوں میں تو دنیا ہے برابر کی شریک
مسئلہ ایک مرے غم ہی کا ذاتی ہے میاں!

اِسی دنیا نے چڑھایا تھا مجھے سُولی پر
اب جو ہر سال مرا عُرس مناتی ہے میاں!

جن سے تم دادِ ہُنر مانگ رہے ہو صابرؔ!
نظر اُنکی تو فقط عیب پہ جاتی ہے میاں!

○

ڈور تھا ساحل بہت دریا بھی طغیانی میں تھا
اک شکستہ ناؤ سا مَیں تیز رَو پانی میں تھا

مُجھ سے مِلنے کوئی آتا بھی تو مِلتا کِس طرح
مَیں تو گھر میں بند خود اپنی نگہبانی میں تھا

آدمیّت کے عوض اس نے خریدا ہی لباس
آدمی تھا آدمی جب عہدِ عُریانی میں تھا

ہے کلب، کے زنگ و رامش میں بھی میرے ساتھ ساتھ
ایک سنّاٹا جو دل کی خانہ ویرانی میں تھا

تھا وہ میرے خیر مقدم کو بظاہر پیش پیش
عکسِ دیگر لیکن اُس کی خندہ پیشانی میں تھا

مقتلِ شام وسحر میں کیا پنپتی زندگی
شبنمستاں ہو نکتے شعلوں کی نگرانی میں تھا

موسمِ گُل بھی جنوں پرور تھا لیکن بیشتر
مصلحت کا ہاتھ میری چاکدامانی میں تھا

صابر اس منظر کی "مووی" لے رہا تھا ایک شخص
شاخ پر اِک آشیاں شعلوں کی تابانی میں تھا

○

سامنا ل کے ہوا کا نہ ہوا
رہے آپس ہی میں لڑتے پتّے
اپنے ہی پیڑ کے سائے میں جلے
سوختہ جسم، سُکڑتے پتّے

○

اور مستحکم ہُوا دل حادثوں کے درمیاں
کچھ سِوا بھڑکا یہ شعلہ آندھیوں کے درمیاں

جب تک اُس کی جیب ظالم وقت نے کاٹی نہ تھی
کِس قدر مقبول تھا وہ دوستوں کے درمیاں

پاس سے دیکھو تو اُڑ جاتا ہے ہر منظر کا رنگ
فاصلہ بھی چاہیئے کچھ رابطوں کے درمیاں

کر رہا ہوں دامنِ صحرا میں پھُولوں کی تلاش
آرزومندِ وفا ہوں دُشمنوں کے درمیاں

آئی تو کجلا گئے کچھ اور بھی دیوار و در
صبح کا چرچا بہت تھا شب زدوں کے درمیاں

مختصر سمجھے تھے شہرِ درد میں اپنا قیام
فاصلہ صدیوں کا نکلا ساعتوں کے درمیاں

بارہا گھر کی گھٹن میں دل نے یہ سوچا، چلو
سو رہیں فٹ پاتھ پر اُن بے گھروں کے درمیاں

ذکرِ دریا سے تو ان کو اور تڑپائے گی پیاس
اور کوئی بات کر تشنہ لبوں کے درمیاں

کام کچھ ہم نے بھی صابرؔ سست گامی سے لیا
مرحلے بھی سخت آئے راستوں کے درمیاں

○

نقشِ قدم نہ بانگِ دَرا چاہیئے اُسے
ذوقِ سفر کا قبلہ نُما چاہیئے اُسے

دل ہے دُھواں دُھواں سا ضیا چاہیئے اُسے
دُھندلا ہو آئینہ تو جِلا چاہیئے اُسے

شبنم سے کیا بُجھے گی بیاباں کی تِشنگی
بَرسے جو ٹوٹ کر وہ گھٹا چاہیئے اُسے

"سچ" بے لباس ہو تو نظر کو بُرا لگے
دیبائے "مصلحت" کی قَبا چاہیئے اُسے

شہروں کے محبسوں میں تو مُرجھا گئی حیات
پھر جنگلوں کی آب و ہوا چاہیئے اُسے

بھرنے لگے ہیں زخم انھیں پھر کُریدیئے
بجھنے لگی ہے آگ ہوا چاہیئے اُسے

تب زخمِ نیشِ غم کے لئے بے قرار تھا
اب زخمِ نیشِ غم کی دَوا چاہیئے اُسے

صابرؔ غموں کی سرد وسیہ راکھ کے تلے
بُجھتا ہوا شَرر ہے ہوا چاہیئے اُسے

○

کبھی رقیب کبھی یارِ مہرباں کی طرح
زمیں بھی رنگ بدلتی ہے آسماں کی طرح

○

پرچھائیوں سے برسرِ پیکار مَیں ہی تھا
لڑتی رہی ہوا سے جو تلوار مَیں ہی تھا

سَب رنگ و بُوئے لالۂ و گُل کے اَمین تھے
گُلشن میں خار و خس کا نگہدار میں ہی تھا

اک بھیڑ تھی پُرانی ڈگر پر رَواں دَواں
ہٹ کر جو چل رَہا تھا وہ رہوار میں ہی تھا

اَب میں نہیں تو شہرِ وفا کیوں اُداس ہے
یہ تو نہیں، کہ لائقِ بازار میں ہی تھا

ڈُوبی بھنور میں ناؤ تو اب کس کو دوش دوں
طُوفاں سے کھیلنے کا طلبگار میں ہی تھا

اَب بے گھری سے پنڈ چُھڑانے کی فکر ہے
تب گھر کے قید و بند سے بیزار میں ہی تھا

غم کی کڑکتی دُھوپ میں جو ڈھ کے رہ گیا
صابر! وہ ریگِ نم کا طرب زار میں ہی تھا

○

ظُلمتِ شب سے اُلجھنا ہے سحر ہونے تک
سَر کو ٹکرانا ہے دیوار میں در ہونے تک

اَب تو اس پھول کی نکہت سے مہکتی ہے حیات
زخمِ دل زخم تھا تہذیبِ نظر ہونے تک

دل ہی جلنے دو شبِ غم جو نہیں کوئی چراغ
کچھ اُجالا تو رہے گھر میں سحر ہونے تک

○

بادل امبر پہ نہ دھرتی پہ شجر ہے بابا!
زندگی دھوپ میں صحرا کا سفر ہے بابا!

تم کہاں آگئے شیشوں کی تمنّا لے کر
یہ تو اک سنگ فروشوں کا نگر ہے بابا!

ہم ہیں قیدِ درودیوار سے آزاد، ہمیں
جس جگہ رات گذاری وہی گھر ہے بابا!

من ہو درویش تو پھر تن پہ قبا ہو کہ عبا
'جوگ' بانا نہیں اندازِ نظر ہے بابا!

بطنِ ہر سنگ میں دیکھے جو کوئی پیکرِ ناز
کِس کو حاصل وہ صنم ساز نظر ہے بابا!

سوچ کر دشتِ تمنّا میں قدم رکھ صابر
اِس رُوتقل میں ہر گام خطر ہے بابا!

○

آجائے اپنی ذات بھی جس میں نظر مجھے
وہ آئینہ دے کاش کوئی شیشہ گر مجھے

پتّھر سمجھ کے راہ کا ٹھکرا رہے ہیں آج
کہتے تھے کل جو شمعِ سرِ رہگذر مجھے

شعلہ بجاں ہوں سوزِ نہاں سے کچھ اس طرح
اب دُھوپ بھی ہے سایۂ شاخِ شجر مجھے

آخر میں کارواں سے الگ ہو کے چل دیا
کب سے اکھر رہی تھی پرانی ڈگر مجھے

اِک وقت تھا کہ ہر کوئی لگتا تھا معتبر
آتا ہے اب تو اپنے ہی سائے سے ڈر مجھے

پنچھی اُڑے تو سُوکھے ہوئے پیڑ نے کہا
رُت پھر گئی تو یہ بھی چلے چھوڑ کر مجھے

پہنے ہوئے ہے شب ہی اُجالوں کا پیرہن
صابرؔ! نہ دو فریبِ طلوعِ سحر مجھے

○

اس درجہ پیچ و تاب کی کیا بات ہے میاں!
بے حاصلی تو وقت کی سوغات ہے میاں!

ہر لمحہ ایک اجنبی منظر ہے سامنے
کس درجہ تیز گردشِ حالات ہے میاں!

چہرہ تو اس کا صبح کی صورت ہے تابناک
سینے میں آدمی کے سیہ رات ہے میاں!

اِس شہر میں نہ شیشۂ احساس لے کے گھوم
ہر سمت سنگِ درد کی برسات ہے میاں!

دردِ حبیب، دردِ جہاں، دردِ زندگی
ہر درد کی اساس غمِ ذات ہے میاں!

عشرت کدہ لگے کبھی وحشت سرا لگے
یہ زندگی بھی طُرفہ طلسمات ہے میاں!

صابر جو خار بوئے گا کاٹے گا خار ہی
دُنیا تو کِشت زارِ مکافات ہے میاں!

○

اونچے قصر، بڑے دروازے اور لمبی چوڑی دیواریں
وقت کی تیز ہوا کے آگے تاش کے پتّوں کی دیواریں

چڑھتی دھوپ، ہوا اور خوشبو سب باہر ہی رہ جاتی ہیں
کتنی اونچی کر رکھّی ہیں لوگوں نے گھر کی دیواریں

شہر شہر چڑھتا آتا ہے، انجانے دریا کا پانی
اِک اِک کر کے بیٹھ رہی ہیں اگلے وقتوں کی دیواریں

دروازوں کے سر پر سایا، تن پر چمکیلی پوشاکیں
آندھی، بارش، دھوپ کی زد میں رہتی ہیں ننگی دیواریں

یا اِن میں دروازے توڑو، یا مسمار انہیں کر ڈالو
مُلکوں مُلکوں کھڑی ہوئی ہیں رنگ و مذہب کی دیواریں

تن اُجلے من میلے ساتھی دیکھے تو مجھ کو یاد آئیں
رنگ برنگے پوسٹروں سے لدی ہوئی میلی دیواریں

اُس کمرے میں بیٹھ کے صاحب لوگوں پر پتّھر مت پھینکو
جس کمرے کے چاروں جانب نازک شیشے کی دیواریں

○

جِدھر نگاہ کریں رنگ و نور کا عالم
ترا خیال بھی ہے تیری انجمن کی طرح

ارضِ شفق پہ خون میں لت پت پڑی ہے رات
مرنے سے پہلے صبح سے جم کر لڑی ہے رات

اندر طلوعِ جام سے ہے دن چڑھا ہُوا
ماتم زدہ سی کمرے کے باہر کھڑی ہے رات

در آئے کِس طرف سے اُجالا، کہ چار سُو
دشتِ انا میں چھاؤنی ڈالے پڑی ہے رات

یہ دوشِ مرمریں پہ پریشاں ہے تیری زُلف
یا چاندنی کے فرش پہ دُھنکی پڑی ہے رات

تم کیا گئے کہ ڈھل گئی دیوار و در کی دھوپ
سُونے مکاں میں پاؤں پسارے پڑی ہے رات

تیشہ بدست نکلیں اُجالوں کے پاسدار
دیوار بن کے راہِ سحر میں کھڑی ہے رات

پَو پھُوٹنے لگی ہے بہت سوئیے میاں!
صاؔبر اب اُٹھ بھی جاؤ گھڑی دو گھڑی ہے رات

○

اشکِ خوں ناب اگر زینتِ مژگاں نہ ہُوا
ضَو سے معمُور شبستانِ دل و جاں نہ ہُوا

دل میں پیوست اگر درد کا پیکاں نہ ہُوا
آدمیّت کا بشر کو کبھی عرفاں نہ ہُوا

بزم کی بزم تھی پہنے ہوئے خوشرنگ نقاب
کون کیسا ہے کسی پر بھی نمایاں نہ ہُوا

کون ہوں کیا ہوں مری زیست کا مقصد کیا ہے؟
حل کسی شخص سے یہ عقدۂ پیچاں نہ ہُوا

دیکھ لیتی کبھی مُڑ کر کہ میں کس حال میں ہوں
تجھ سے اتنا بھی مری عمرِ گریزاں نہ ہُوا

کاٹ دی اپنی حیات اُس نے اپاہج کی طرح
اپنے ماحول سے جو دست وگریباں نہ ہُوا

زندگی سڑ گئی ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح
حادثہ کوئی اگر زلزلہ ساماں نہ ہُوا

سیپ تو سیپ ہی کے مول اُٹھے گی بارو
اُس کے دامن میں اگر گوہرِ غلطاں نہ ہُوا

آئینہ جو بھی اُٹھایا تھا وہ صیقل سے تہی
اپنی پہچان کا صابر کوئی ساماں نہ ہُوا

○

انبارِ آرزو کو کہیں پھینکتے چلیں
سر پر نہ ہو یہ بوجھ تو ہم جھومتے چلیں

دشتِ جنوں میں کوئی شجر دُور تک نہیں
کچھ دیر اپنے سائے تلے بیٹھتے چلیں

پھرتے ہیں خاک چھانتے خود کی تلاش میں
آج اپنی ذات کا بھی کنواں جھانکتے چلیں

چھت پر دراز ہے ترے جلووں کی چاندنی
ہم بھی کوئی کمندِ نظر پھینکتے چلیں

بے شک ہوا سے کچھ نہ ملے دھول کے سوا
خوشبو کی طرح خود کو یہاں بانٹتے چلیں

اُڑتے ہیں تال میل ہیں ڈوری ہو یا پتنگ
کٹ جائیں تو زمیں کی طرف ڈولتے چلیں

ہوتے ہیں تیز گام ہی منزل سے ہم کنار
جو سُست رَو ہیں گردِ سفر پھانکتے چلیں

کچھ لوگ صابرؔ اس سے کبھی مطمئن نہ ہوں
کچھ لوگ زندگی کے مزے لُوٹتے چلیں

○

مری حیات کے بے آب و رنگ شیشے پر
تری نگاہِ محبت پڑی کرن کی طرح

○

دن میں جو طُرفہ حسیں خواب بُنا کرتے ہیں
رات بھر نیند اُچٹنے کا گِلہ کرتے ہیں

یہ الگ بات ہے دیکھے نہ کوئی اُن کی بہار
ریگ زاروں میں بھی کچھ پھول کھِلا کرتے ہیں

آئینہ لے کے سرِ عام نہ گلیوں میں پھرو
اپنی پرچھائیں سے کچھ لوگ ڈرا کرتے ہیں

بجلیوں پر ہی تو یہ حادثہ موقوف نہیں
آشیاں آتشِ گُل سے بھی جلا کرتے ہیں

رات کے گھور اندھیرے سے ہراساں کیوں ہو؟
نئے سورج اِسی 'کالک' میں اُگا کرتے ہیں

کیا عجب دَور ہے لوگ اپنی ہی لاشوں کو اُٹھائے
رات دن شہر کی گلیوں میں پھرا کرتے ہیں

ایٹمی دَور میں رہتے ہوئے صابر! کچھ لوگ
سنگ و آہن کے زمانے میں رَہا کرتے ہیں

○

نہ کہیں ابر کی چادر، نہ شجر کا سایا
کِس طرح پار کریں زیست کا تپتا صحرا

سوچ کا زاویہ میں نے جو بدل کر دیکھا
ہر بَدن پر نظر آیا مجھے اپنا چہرا

ایک ٹہنی سے مُعلّق نہ ہو گُل کی مانند
موجِ نکہت کی طرح پھَیل، سبھی کا ہو جا

اہلِ دل ! آؤ ذرا پُرسشِ احوال کریں
"زندگی سوچ کے سائے میں کھڑی ہے تنہا"

کِتنے اَوتار ہوئے، کِتنے پیمبر آئے
آدمی کو نہ میسّر ہُوا انساں ہونا

سفرِ زیست میں کچھ ہاتھ نہ آیا صابر
آرزوؤں کے سرابوں میں بھٹکنے کے سِوا

○

غیر کا عیب ہُنر ہے اپنا
خوُب اندازِ نظر ہے اپنا

اَب کوئی گھاٹ نہ گھر ہے اپنا
دشت دَر دشت سفر ہے اپنا

دیکھیئے فاصلہ طے ہو کہ نہ ہو
خود سے خود تک کا سفر ہے اپنا

دیکھ کر شیشوں کے چہرے پہ غُبار
عکس بھی خاک بہ سَر ہے اپنا

غیر دشمن کو نہیں کہہ سکتے
وہ بہ اندازِ دگر ہے "اپنا"

ٹوٹتے خواب، سُلگتی یادیں
یہی سامانِ سفر ہے اپنا

ناگہاں قتل نہ کر دوں خُود کو
ہر نفس مجھ کو خطر ہے اپنا

کون ذرّے کو سمجھتا ہے گہُر
بہ فقط حُسنِ نظر ہے اپنا

بارشِ سنگ کی زد میں صابرؔ
بھُربھرے کانچ کا گھر ہے اپنا

○

سخن وہ جو پیغمبرانہ بھی ہو
ترانہ بھی ہو تازیانہ بھی ہو

○

بہت تیز خوشبو ہواؤں میں تھی
عجب رنگ اگلی بہاروں میں تھا

نگاہوں نے پیچھا کیا دُور تک
کوئی تجھ سا اُن ماہ پاروں میں تھا

جو کل زلزلے میں کھنڈر ہو گئے
مرا گھر اُنہیں خواب زاروں میں تھا

ترے در سے جو نامراد اُٹھ گئے
مری جاں! میں اُن بیشماروں میں تھا

ندامت تھی یا مصلحت کیا خبر
وہ قاتل مرے سوگواروں میں تھا

بتاتا ہے جو خود کو میرا رقیب
یہ کل تک مرے رازداروں میں تھا

ہواؤں کی یلغار سے رات کو
عجب شور و غُل شاخساروں میں تھا

ہُوا مجھ پہ پتھراؤ صابرؔ کہ مَیں
محبّت کے آئینہ داروں میں تھا

○

خُنکیٔ سایۂ دیوار میں سونے والے
دوپہر کیسے گذرتی ہے یہ دیوار سے پُوچھ

○

تیشۂ فن سے اگر اِس کو تراشا ہوتا
تیرے ہاتھوں میں جو پتھر ہے نگینا ہوتا

کیا مِلا خود کو سمندر پہ نچھاور کرکے
کاش یہ ابر کسی دَشت پہ برسا ہوتا

میرے پندار کو آئینہ دِکھانے والو
اپنا چہرہ بھی تو اس میں کبھی دیکھا ہوتا

اب تو اُٹھتی ہی نہیں کوئی نظر میری طرف
"میل پتّھر" ہی کسی راہگذر کا ہوتا

کتنے نادیدہ مناظر ہیں اُدھر جنّتِ دید
کبھی دیوار کے اُس پار بھی دیکھا ہوتا

تیرے اندر بھی ہے اِک عالمِ نیرنگ آباد
اِس ولایت میں کبھی گھوم کے دیکھا ہوتا

شہر میں آئینہ لے کر جو نہ پھرتا صابرؔ
سنگباری سے نہ لوگوں نے نوازا ہوتا

○

گھومتے پھرتے تری چھت پر جو آئی چاندنی
تیرا مُکھڑا دیکھ کر کیا کیا لجائی چاندنی

چھینتے رُخ سے شفق نے لالہ تابی لُوٹ لی
چاند نے تیرے تبسّم سے چُرائی چاندنی

رات کی یادوں کے ماتھے پر پسینہ آگیا
صبح کو جب دُھوپ بن کر سر پہ چھائی چاندنی

سامنا تجھ سے ہوا تھا جُھٹپٹے میں ایک شام
پھر نہ دُھوپ اچھی لگی دل کو نہ بھائی چاندنی

صابر اپنی زندگی ہے اُس گھنے بَن کی طرح
جس میں کُھل کر دُھوپ ہی پھیلی نہ چھائی چاندنی

○

کبھی دہکتی، کبھی مہکتی کبھی مچلتی آئی دھوپ

ہر موسم میں آنگن آنگن رُوپ بدلکر چھائی دھُوپ

اُس کو زخم مِلے دُنیا میں جس نے مانگے تازہ پھُول

جس نے چاہی چھاؤں کی چھتری اُسکے سَر پر چھائی دھُوپ

جانے اپنا رُوپ دکھا کر کِس نے پردہ تان لِیا

کس کی کھوج میں آوارہ ہے انگنائی انگنائی دھوپ

چڑھتے سورج کی کرنیں ہیں دولت، عزّت، شہرت، شان

آخر آخر ہر دیوار سے، یارو ڈھلتی آئی دھُوپ

دانش کی افزونی اکثر کرتی ہے دل کو گمُراہ

تیز زیادہ ہو تو چھینے آنکھوں کی بینائی دھُوپ

ماتھے پر سیندور کی بندیا، تھالی میں کچھ سُرخ گلاب
نوُر کے تڑکے اوشا تٹ پر پوجا کرنے آئی دھوپ

کون بڑھائے پیار کی پینگیں اس نٹ کھٹ بنجارن سے
پھرنے کو تو نگری نگری پھرتی ہے ہرجائی دھوپ

جنم جنم کے اندھیارے کا جادو چھن میں ٹوٹ گیا
صابرؔ آج ہری کٹیا میں چپکے سے در آئی دھوپ

○

قبائے لالہ و گُل بھی ہے خوب اپنی جگہ
مگر کہاں وہ پھبن تیرے پیرہن کی سی

○

راہ کا پتّھر ہوں پیہم ٹھوکروں کے درمیاں
کوئی مجھ کو پھینک دے صورت گروں کے درمیاں

تھا یہی اُس کی خطا کاری کا اِک بیّن ثبوت
وہ نہتّا تھا برستے خنجروں کے درمیاں

کِس طرح ہوتی وہ چشمِ شوق منزل آشنا
کھو گئی جو راستے میں منظروں کے درمیاں

ہر ڈگر لے آئی مجھ کو نقطۂ آغاز پر
گھومتا پھرتا رہا مَیں دائروں کے درمیاں

وقت کی پاگل ہوائیں، میری ہمّت کے چراغ
کارزارِ سخت ہے دو لشکروں کے درمیاں

جب ہوئے اپنوں کی اپنائیت کے جوہر آشکار
جا بسے گھر چھوڑ کر ہم دوسروں کے درمیاں

صابران حالات میں یوں کٹ رہی ہے زندگی
جس طرح شیشہ لُڑھکتے پتّھروں کے درمیاں

○

اور ہونگے وہ کوئی آنکھ چُرانے والے
زندگی ہم ہیں ترے ناز اُٹھانے والے

معتبر سایۂ نہ تکیہ نہ بُلندی اِس کی
خوش نہ ہوں ریت کی دیوار اُٹھانے والے

پُتلیاں دیتی رہیں اہلِ تماشا کو فریب
پسِ پردہ ہی رہے تار ہلانے والے

اپنے ماتھے کی سیاہی سے رہے بیگانہ
ماہ و خورشید کو آئینہ دِکھانے والے

ہم ہیں خوشبُو کے خریدار ہمیں کیا دینگے
کاغذی پھُول دُکانوں میں سجانے والے

اُڑتے لمحوں کے تعاقب میں نہ ہو سر گرداں
یہ پرندے نہیں اب دام میں آنے والے

اپنی فطرت کا بھی کرلیں کبھی لیکھا جوکھا
مجھ گنہ گار پہ الزام لگانے والے

یوں بھی اکثر ہُوا پندارِ اَنا میں صابرؔ!
راستا بھُول گئے راہ دکھانے والے

○

دیکھو بھری بہار میں کہسار کا بدن
جیسے بنی ٹھنی کسی مٹیار کا بدن

اِک لمحے کا لباس اُتاریں تو سامنے
جلوہ فشاں ہو سینکڑوں ادوار کا بدن

یہ کون بخت سوختہ اس سے لپٹ گیا
لو دے اُٹھا ہے سایۂ دیوار کا بدن

لہجہ مرے شعور کی ابریشمی قبا
الفاظ میری سوچ کے اظہار کا بدن

پہنا دیا ہے اس کو علامت کا پیرہن
عُریاں نہیں ہے اب مرے اشعار کا بدن

برفاب کی رِدا تھی گئے موسموں کی یاد
صابرؔ ٹھٹھر گیا مرے افکار کا بدن

○

کِس کو آواز دے رہا ہے میاں!
وقت کب مُڑ کے دیکھتا ہے میاں!

تیرگی بھی ہے ایک منظر، دیکھ
سُن کہ سنّاٹا بولتا ہے میاں!

کیا مِٹے تِشنگی کہ دشتِ حیات
اِک سرابوں کا سِلسلا ہے میاں!

اپنا دُکھ لے کے بیٹھ رہ گھر میں
شہر میں کون پوچھتا ہے میاں!

جانے کب طے ہو یہ سفر صابرؔ!
خود سے ملنے کا مرحلہ ہے میاں!

○

رات بزمِ عیش میں دیکھا جو ہم نے غور سے
رنج و غم تھے قہقہوں کا پیرہن پہنے ہوئے

کیسے کیسے لوگ غم کی دھوپ میں سنولا گئے
چاندنی کے لمس سے جن کا بدن میلا لگے

گھوم لینے دو چمن میں آج مثلِ برگِ خشک
کل زمانے کی ہوا جانے کدھر کو لے اُڑے

دے کے دستک دیکھنا واپس نہ ہو جائے کہیں
اِک کرن باہر کھڑی ہے اُٹھ کے کھڑکی کھولیئے

اب کھُلا آکر کہ وہ اپنے سوا کوئی نہ تھا
جستجو میں جس کی ساری عمر آوارہ رہے

بیٹھے بیٹھے ہو گیا میں ایک سے صد پارہ ایک
جَڑ دیئے دیوار در دیوار کس نے آئینے ؟

○

یہ کس طلسم کا منظر دکھائی دینے لگا
کہ ہر گلی میں ترا گھر دکھائی دینے لگا

میں اپنے قتل کا مجرم ہوں چھپتا پھرتا ہوں
یہ خواب اب مجھے اکثر دکھائی دینے لگا

کبھی کھٹکنے لگا نوکِ خار کی صورت
کبھی زمانہ گلِ تر دکھائی دینے لگا

کیا ہے جب سے کسی مہرباں نے قتلِ خلوص
ہر آستین میں خنجر دکھائی دینے لگا

کچھ ایسے جم کے تری یاد کی گھٹا برسی
کہ دل کا دشت سمندر دِکھائی دینے لگا

یہ حادثہ ہے جو کل تک چراغِ منزل تھا
وہ آج راہ کا پتھر دِکھائی دینے لگا

یہ کوئی خواب ہے یا ذاتِ آگہی صابرؔ
میں اپنے جسم سے باہر دِکھائی دینے لگا

○

آئینہ لے کے جو مَیں دل کی سڑک پر نکلا
مجھ سے ہر خواب مرا آنکھ چُرا کر نکلا

دُور سے چاند کا ٹکڑا نظر آتا تھا وہ شخص
پاس سے دیکھا تو بے رنگ سا پتھر نکلا

مَیں سمجھتا تھا جسے تیری نظر کا پیکاں
وہ مرے اپنے ہی احساس کا نِشتر نکلا

ایک پَل کو بھی کہیں رُک کے ٹِھکانہ نہ کِیا
کِس قیامت کا مرے پاؤں میں چکّر نکلا

تجربوں نے تو کئی بار لگائی آواز
دل وہ آوارہ کہ اک دن بھی نہ گھر پر نکلا

وقت کے ہاتھوں ہی ہر زخم کی سوغات ملی
وقت ہی چاکِ دل و جاں کا رفوگر نکلا

اِک حسیں یاد نے پیچھے سے پکارا صابرؔ
ایک سایا مرے آگے سے سمٹ کر نکلا

○

سیلابِ خواہشوں کا جو چڑھ کر اُتر گیا
شہرِ ہوس میں درد کا لشکر اُتر گیا

کس گھاٹ جا لگیں وہ سماعت کی کشتیاں؟
کس دشت میں صدا کا سمندر اُتر گیا؟

کس درجہ خام تھا مرے دیوار و در کا رنگ
بارش ذرا پڑی تو سراسر اُتر گیا

رکھا تھا آستین میں جو غیر کے لئے
آخر مرے ہی دل میں وہ خنجر اُتر گیا

میں نے تو سطحِ آب پہ پھینکا تھا دوستو!
بھاری تھا خود ہی تہہ میں وہ پتّھر اُتر گیا

صابر! سُلگتی ریت کو پھیلا کے دُور تک
اِک موج میں سمٹ کے سمندر اُتر گیا

○

سیم وزر چاہے نہ الماس وگہر مانگے ہے
دل تو درویش ہے اُلفت کی نظر مانگے ہے

جب غزل مجھ سے کوئی مصرعِ تر مانگے ہے
کاوشِ فکر مرا خونِ جگر مانگے ہے

دل کو ہے عافیتِ انجمنِ گُل کی طلب
زندگی دشتِ مغیلاں کا سفر مانگے ہے

مجھ کو لے جائے جو انجانے دیاروں کی طرف
میری آوارہ مزاجی وہ ڈگر مانگے ہے

اپنے ماحول سے ہر شخص ہے مائل بہ فرار
کوئی بیزار ہے گھر سے کوئی گھر مانگے ہے

تھے جو رنگینیٔ دامانِ نظر کا ساماں
دیدۂ شوق وہی شام و سحر مانگے ہے

کل بھی جاں بازی کرتے تھے نگہداریٔ حق
یہ جنوں آج بھی نذرانۂ سر مانگے ہے

ہو جہاں عیب شماری ہی پرکھ کا مفہوم
صابر اُس شہر میں کیا دادِ ہنر مانگے ہے

○

یوں تو محفل میں نا آشنا کون تھا؟
مجھ کو میرے سوا جانتا کون تھا؟

میری لغزش پہ کرتے مجھے کیا خجل
سب خطاوار تھے بے خطا کون تھا؟

عمر بھر جو مرا ساتھ دیتا رہا
اے غمِ زندگی! تُو مرا کون تھا؟

ناز تھا سب کو اپنے خد و خال پر
آئینے کی طرف دیکھتا کون تھا؟

میرے اندر یہ کیا زلزلہ سا اُٹھا؟
یہ جو دیوار سا ڈھہ گیا کون تھا؟

ہر کوئی اور کوئی تھا صابر وہاں
کون کیا تھا، یہ پہچانتا کون تھا؟

○

چہروں سے غم کی دُھول اُتارو مسافرو!
کچھ اپنا رنگ رُوپ نِکھارو مسافرو!

جب پاس کچھ نہیں تو لُٹیروں کا خوف کیا
بے فکر ہو کے رات گزارو مسافرو!

اِس شہرِ بے لحاظ میں کھولے گا کون در؟
ناحق گلی گلی نہ پُکارو مسافرو!

مہماں سرا میں مُہلتِ راحت ہے مُختصر
گھر کی طرح نہ پاؤں پَسارو مسافرو!

انبارِ آرزو کے سبب ہیں یہ لغزشیں
یہ بوجھ اپنے سر سے اُتارو مسافرو!

گم ہو کے رہ نہ جاؤ کہیں گردِ راہ میں
خود کو بھی گاہ گاہ پُکارو مسافرو!

صابر سفر شناس و مسافر نواز ہے
کچھ وقت اس کے ساتھ گذارو مسافرو!

○

اوّل اوّل جس پر تھا وسواس بہت
آخر آخر اُس نے توڑی آس بہت

خلوت میں لگتا ہے اپنے پاس ہوں مَیں
بِھیڑ میں تھا تنہائی کا احساس بہت

یہ دُنیا اِک ایسی دَھرتی ہے جس پر
ہَریالی کم، پیلی سُوکھی گھاس بہت

تعبیروں کا کھاتہ بالکل کورا ہے
خوابوں کی دولت ہے اپنے پاس بہت

وہ سُورج بھی کالا پڑتا جاتا ہے
جس کے پرتَو سے روشن تھی آس بہت

کچھ لوگوں نے صابر اس کی مانگ بھَری
کچھ لوگوں نے کِیا غزل کا ناس بہت

○

ہر وہ لمحہ جو مئے عیش پلاتا ہے مجھے
غم کی دہلیز پہ کیوں چھوڑ کے جاتا ہے مجھے؟

میں تو نغمہ ہوں کوئی لَے نہیں میری مخصوص
ہر مغنّی الگ انداز سے گاتا ہے مجھے

کوئی اندیشہ ہے اپنوں سے نہ بیگانوں سے
میرے اندر ہی کوئی ہے جو ڈراتا ہے مجھے

میرا ہر نقش کوئی حرفِ غلط ہو جیسے
یوں وہ لکھ لکھ کے سرِ لوح مٹاتا ہے مجھے

میں نے دیکھی نہ ہو جیسے کبھی اپنی صورت
جو بھی آتا ہے وہ آئینہ دکھاتا ہے مجھے

اِتنے واضح نہ تھے عشرت میں خدوخالِ حیات
اَب تو کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے

رَونقِ محفلِ یاراں میں بھی اکثر صابر
کربِ تنہائی کا احساس سَتاتا ہے مجھے

○

لئے جاتا ہے موت کی جانب
ہر نفس زندگی کا دشمن ہے

○

مِرا وجود ہے اِک نقشِ آب کی صورت
شکست جس کا مقدّر ہے خواب کی صورت

بکھر نہ جاؤں فضا میں ورق ورق ہو کر
ہوا کی زد میں ہوں کُہنہ کتاب کی صورت

تمنّا حد سے بڑھے گا تو ٹوٹ جائیں گے
دِلوں کے رابطے تارِ رباب کی صورت

کسی بھی لمحے نکل جاؤں گا ہوا کی طرح
مِرا بدن ہے حصارِ حباب کی صورت

درونِ سینہ کوئی چیختا ہے شام و سحر
یہ قہقہے تو ہیں رُخ پر نقاب کی صورت

مرورِ وقت سے نشّہ ہوا سوا صابر
مری 'انا' تھی پُرانی شراب کی صورت

○

کچھ دن رہ کر ساتھ وہ چینچل چھوڑ گیا
ذہن پہ گہری سوچ کے بادل چھوڑ گیا

سُوکھی ریت سمجھ کے راہی ڈُوب گئے
باڑھ کا پانی کیسی دَل دَل چھوڑ گیا

سونے کی زنجیر پڑی تھی راہوں میں
دانش وہ بے بھاگا پاگل چھوڑ گیا

آج دھُوندھیا بادل کی اَنگنائی میں
کون اپنا ست رنگا آنچل چھوڑ گیا

آگ لگے ہیں کون وَھڑے کے ساتھ رہے
جس کو پہنچی آنچ وہی دَل چھوڑ گیا

صابرؔ جس کا محفل سے جی اُوب گیا
بجتے ساز چھنکتی پائل چھوڑ گیا

○

کیسے کیسے اُجلے چہرے، کیسے کیسے پیارے لوگ؟
اِس جادو نگری میں آکر لُٹ گئے ہم بنجارے لوگ

آج یہ کیسا سنّاٹا ہے آوازوں کی بستی میں
کیوں پھرتے ہیں سہمے سہمے چُپ سادھے دم مارے لوگ

نئی ڈگر کے ہر راہی کو کچھ دن پاگل کہتے ہیں
پھر اُس پاگل ہی کے پیچھے لگ جاتے ہیں سارے لوگ

سُکھ کی پرچھائیں کے پیچھے سب بھرمائے پھرتے ہیں
بھوگی، روگی، رمتا جوگی، بیبلانی، بنجارے لوگ

باہر کی نوتن دنیا کے رنگ رُوپ کو کیا جانیں
اُونچی اُونچی دیواروں میں گھرے ہوئے بیچارے لوگ

طوفانی لہروں میں صابرؔ ناؤ کس کی ڈوب گئی
کھیل سمجھ کر رہے دیکھتے بیٹھے ندی کنارے لوگ

کھڑکی کھڑکی دَر و براجے، چوکھٹ چوکھٹ بیٹھی سوچ
نگری نگری نِپٹ اُداسی، گھور نراشا، گہری سوچ

کبھی دامنی، کبھی چاندنی، شاپ کبھی، وَردان کبھی
مانو تا کے رَنگ منچ پر کیا کیا سوانگ رچاتی سوچ

کل تک جن کو کُندن کہتے آئے تھے پیتل نِکلے
نَول کسوٹی لے کر جب اتہاس دوارے پہنچی سوچ

"یہ کیسا بھونچال تھا جس سے نگر نگر کہرام مچا"
ٹوٹے کھنڈروں کے ملبے پر سیس جھکائے بیٹھی سوچ

اِدھر اُدھر کی باتوں میں صابر اب من کو بہلاؤ
سپنوں کے رنگین کھلونے توڑ گئی پتھریلی سوچ

○

پہلے تو اِک جھوٹ مِرے کھاتے میں ڈالا لوگوں نے
پھر اُس جھوٹ کو محفل محفل خوب اُچھالا لوگوں نے

رائی کو پربت ٹھہرایا، قطرے کو سیلاب کہا
افسانہ در افسانہ ہر لفظ کو ڈھالا لوگوں نے

اب جس کی غرقابی پر یہ ہاہاکار ہے پوچھو تو؟
پہلے کیوں اُس کشتی کو گرداب میں ڈالا لوگوں نے

شیشہ لے کر جو نِکلا بازار میں وہ معتوب ہُوا
جِس نے پتّھر مارے اُس پر ہاتھ نہ ڈالا لوگوں نے

کوئی بھی بے عیب نہیں ہے دُنیا میں یہ کہنے کو
چاند میں بھی اک کالا دھبّہ ڈھونڈ نکالا لوگوں نے

ہر شے پر کہرے کی چادر، ہر صورت پر چھائیں سی
پھیلا یا ہے گھر گھر کیا تاریک اُجالا لوگوں نے؟

اِس اندھی نگری میں بابا جس نے رات کو رات کہا،
اُس کے مُنہ پر ڈال دیا ہے موت کا تالا لوگوں نے

شہر میں رہنا ہے تو صابر 'مریادا' کی بات نہ کر
'رام'، کو تو ہر یگ میں دیا ہے دیس نکالا لوگوں نے

○

جب مصیبت ہوئی نازل تو سبھی ایک ہوئے
قہرِ تخریب میں تعمیر کا پہلو نکلا

○

لمحہ لمحہ ہے گرانبار بچالو مجھ کو
بے کراں وقت کے ملبے سے نکالو مجھ کو

خشک پتّہ ہی سہی رونار کے آگے نہ بڑھو
مَیں گئی رُت کی نِشانی ہوں اُٹھالو مجھ کو

بھاگتی بھیڑ نے جانے کسے پامال کِیا
چیخ کر کوئی پُکارا تھا "بچالو مجھ کو"

لمسِ تیشہ کو ترستا ہوا اِک سنگ ہوں مَیں
بُت گرو آؤ کسی شکل میں ڈھالو مجھ کو

مَیں تو محتاجِ نواساز ہوں نغمے کی طرح
تم مغنّی ہو کسی راگ میں گالو مجھ کو

خود پسندی کی خلاؤں میں پھروں آوارہ
اُس بلندی پہ تو یارو نہ اُچھالو مجھ کو

مَیں رفاقت کی گھٹا بَن کے برس جاؤں گا
اپنی تنہائی کے صحرا میں بُلا لو مجھ کو

شبِ تاریک کا پُر ہول سفر ہے صابر
شمعِ منزل ہوں سرِ راہ جلا لو مجھ کو

○

یقیں کا مہر بھی دیتا رہا حیات کو نور
گماں بھی ساتھ رہا مستقل گہن کی طرح

○

خود سے بھی کبھی حساب لیں ہم
غیروں ہی کے عیب کیوں گنیں ہم

قُربان تری نوازشوں کے
اتنا نہ ہنسا کہ رو پڑیں ہم

برہم ہے مزاجِ اہلِ دانش
اے وحشتِ دل کدھر چلیں ہم

یہ زیست تو دُھوپ کا سفر ہے
کیوں چھاؤں کی آرزو کریں ہم

حالات کی یہ ستم ظریفی؟
ناخُوب کو خُوب تر کہیں ہم

شبنم ہی تھی بہت سُبک جاں
سُورج کی کِرن کو کیا کہیں ہم

اپنوں نے کب خلوص برتا
غیروں سے کیا گِلہ کریں ہم

صابرؔ! ہے کون سُننے والا
صحرا میں کیا اذان دیں ہم

○

دہ لے گیا نہ اُس کی اَدا لے گئی مجھے
مقتل میں رسمِ پاسِ وفا لے گئی مجھے

اندر سے کھوکھلا جو تھا بیلوں کی طرح
چاہا جدھر ہوا نے اُڑا لے گئی مجھے

اِک حرف تھا جو تم نے سُنا اَن سُنا کِیا
اب ڈھونڈتے پھرو کہ صدا لے گئی مجھے

ساحل سے میرا پاؤں پھسلنے کی دیر تھی
اِک موجِ بے پناہ. بہا لے گئی مجھے

بیٹھا تھا چھُپ کے اوس کی ٹھنڈی پھُوار میں
آئی کڑکتی دھوپ اُٹھا لے گئی مجھے

جاتا کہاں کہ آگے کوئی راستا نہ تھا
اندھی گپھا میں میری اَنا لے گئی مجھے

تھا کون جو پُکارتا چُپ کے پہاڑ سے
صاؔبر مری نِراہی بُلا لے گئی مجھے

صاؔبر! میں ریزہ ریزہ خلا میں بکھر گیا
اتنی بُلندیوں پہ ہوا لے گئی مجھے

○

ویسا نہیں ہے کوئی بھی جیسا دکھائی دے
موجِ سراب دُور سے دریا دِکھائی دے

جس سے مِلو وہ سوچ میں گم سا دکھائی دے
ہر شخص انجمن میں اکیلا دِکھائی دے

کِس طرفگی سے مُوڈ بدلتا ہے آدمی
شبنم دکھائی دے کبھی شُعلہ دِکھائی دے

ہر دن گذارتا ہوں میں لبِ تشنگی کے ساتھ
ہر رات مجھ کو خواب میں دریا دِکھائی دے

جس آئینے کی گرد کوئی جھاڑتا نہیں
اُس آئینے میں چاند بھی میلا دِکھائی دے

بچ کر رہو کہ شہر یہ جادُوگروں کا ہے
قاتِل بھی اس نگر میں مسیحا دکھائی دے

چھایا ہوا ہے ذہن پہ جو گرد کی طرح
بیتی رُتوں کی یاد کا کُہرا دکھائی دے

دیکھو تو اِک بساطِ حقیقت ہے زندگی
سوچو تو پُتلیوں کا تماشا دکھائی دے

بیٹھا ہے کب سے سوچ کے سائے میں سر بہ خم
صابرؔ غموں کی دھوپ کا مارا دکھائی دے

ہر ایک شخص خفا مجھ سے انجمن میں تھا
کہ میرے لب پہ وہی تھا جو میرے من میں تھا

کسک اُٹھی تھی کچھ ایسی کہ چیخ چیخ پڑوں
رہا میں چُپ ہی کہ بہروں کی انجمن میں تھا

اُلجھ کے رہ گئی جامے کی دل کشی میں نظر
اُسے کسی نے نہ دیکھا جو پیرہن میں تھا

کبھی ہوں دشت میں آوارہ اِک بگولا سا
کبھی میں نکہتِ گُل کی طرح چمن میں تھا

میں اُس کو قتل نہ کرتا تو خود کُشی کرتا
وہ اِک حریف کی صورت مِرے بدن میں تھا

اُسی کو میرے شب و روز پر محیط نہ کر
وہ ایک لمحۂ کمزور جو گہن میں تھا

مِری صدا بھی نہ مجھ کو سُنائی دی صابر
کچھ ایسا شورش و ہنگامہ انجمن میں تھا

○

کبھی تو جس سے مِلوں مُعتبر لگے مجھ کو
کبھی یہ حال کہ خُود سے بھی ڈر لگے مجھ کو

○

کٹی پتنگ ہوں سمتِ سفر سے کیا مجھ کو
اُڑا کے "چاہے جدھر" پھینک دے ہوا مجھ کو

چراغ ہوں تو سرِ انجمن جلا مجھ کو
ہوں سنگِ راہ تو پھر راہ سے ہٹا مجھ کو

خدا کرے کہ نہ پھر ہو یہ تجربہ مجھ کو
کبھی کبھی وہ کوئی دوسرا لگا مجھ کو

تمام عمر سیاہی گئی نہ چہرے کی
اک ایسے لمحۂ تاریک نے ڈسا مجھ کو

وہ نقشِ پا بھی بگولوں کی زد میں آ کے مٹے
دکھا رہے تھے جو منزل کا راستہ مجھ کو

مجھی پہ ختم ہوئی جستجو کی راہ گذر
مرے سوا سرِ منزل نہ کچھ ملا مجھ کو

رکا تو یوں تھا کہ اُن کو بھی ساتھ لے کے چلوں
وہ ہنس رہے ہیں سمجھ کر شکستہ پا مجھ کو

بھٹک گیا ہوں غمِ زندگی کے جنگل میں
ترا خیال کہیں ہو تو دے صدا مجھ کو

میں کچھ تو خود ہی تھا صابرؔ چراغِ مفلس کا
کچھ اُس نے تیز ہواؤں میں رکھ دیا مجھ کو

○

بدل اگر یہ تقاضا کرے بدلنے کا
زمانہ ہے یہ زمانے کے ساتھ چلنے کا

بجھا رہے تھے کہ اُن تک بھی آنچ جاتی تھی
کسی کو رنج نہ تھا میرے گھر کے جلنے کا

یہ غم کا جام ہے؟ لا! مجھ کو دے کہ اور یہاں
کسی میں دم نہیں اس زہر کو نگلنے کا

ہمارے خون سے جلتے ہیں انجمن میں چراغ
ہمارے بعد نہیں اک دیا بھی جلنے کا

قفس کھلا بھی، نشیمن پکارتا بھی رہا
ہمیں سے ہو نہ سکا حوصلہ نکلنے کا

نسیمِ صُبحِ ستم ڈھا گئی بُجھا کے اُسے
ابھی دیئے میں بہت ولولہ تھا جلنے کا

عجیب موڑ پہ آکر ٹھہر گئے دونوں
نہ چھوڑنے کا ارادہ نہ ساتھ چلنے کا

لہو کی آگ ملا آنسوؤں کی گرمی میں
اِس آنچ سے کوئی پتّھر نہیں پگھلنے کا

تمام عمر رہا باعثِ پریشانی
وہ حادثہ جو گذرنے کا تھا نہ ٹلنے کا

کہاں گئے وہ رفیقانِ مُعتبر صابر
چلے تھے باندھ کے پیماں جو ساتھ چلنے کا

○

دُور ہی دُور سے خوشیوں نے تو ٹالا ہے مجھے
غم نے اخلاص کے آغوش میں پالا ہے مجھے

غیر تو ہو نہیں سکتا کوئی اپنا ہو گا
مار کر جس نے گھنی چھاؤں میں ڈالا ہے مجھے

کِس وسیلے سے ہو دُنیا سے تعارُف میرا
کون یاں میرے سِوا جاننے والا ہے مجھے

دُور تک سایۂ تسکیں کا کہیں نام نہیں
کِس ڈگر پر مرے احساس نے ڈالا ہے مجھے

'دیوتا' کی طرح 'دانو' بھی ہے میرا حقدار
مِل کے دونوں نے سمندر سے نکالا ہے مجھے

پھر بھی اک روز پٹک دے گی زمیں پر صابر
جس ہوا نے سَرِ افلاک اُچھالا ہے مجھے

○

بُوند پانی کی ہوں تھوڑی سی ہوا ہے مُجھ میں
اِس بضاعت پہ بھی کیا طُرفہ اَنا ہے مجھ میں

یہ جو اِک حشرِ شب و روز بپا ہے مُجھ میں
ہو نہ ہو اور بھی کچھ میرے سوا ہے مُجھ میں

صفحۂ دہر پہ اِک راز کی تحریر ہوں مَیں
ہر کوئی پڑھ نہیں سکتا جو لکھا ہے مجھ میں

کبھی شبنم کی لطافت کبھی شعلے کی لپک
لمحہ لمحہ یہ بدلتا ہوا کیا ہے مجھُ میں؟

شہر کا شہر ہو جب حشر کے میداں کی طرح
کون سنتا ہے جو کہرام مچا ہے مجھ میں

توڑ کر ساز کو شرمندۂ مضراب نہ کر
اب نہ جھنکار رہے کوئی نہ صدا ہے مجھ میں

وقت نے کر دیا صابرؔ مجھے صحرا بہ کنار
اِک زمانے میں سمندر بھی بہا ہے مجھ میں

○

کتر کے پر وہ ہوا میں اُچھالتا ہے مجھے
شکستِ ذات کے دوزخ میں ڈالتا ہے مجھے

طلسمِ حُسنِ تمنّا میں ڈالتا ہے مجھے
وہ خود نہ مِل کے کھلونوں پہ ٹالتا ہے مجھے

مِرے وجود میں باقی ہے کھوٹ کا عنصر
کہ بار بار وہ بھٹّی میں ڈالتا ہے مجھے

وسُدھا کے ساتھ سمندر سے وِش ابھی نکلیگا
تُو شِو نہیں ہے تو پھر کیوں کھنگالتا ہے مجھے

یہ سوچ کر سہے جاتا ہوں زخمِ تیشۂ وقت
چٹان ہوں کسی پیکر میں ڈھالتا ہے مجھے

ہر ایک شوق نے خوش آمدید پر یہ کہا
"میں ایک روگ ہوں کیوں دل میں پالتا ہے مجھے؟"

ہجومِ رنگ و تماشا میں لگ گیا جب دل
بھری سبھا سے وہ ظالم نکالتا ہے مجھے

کوئی تو ہے جو نشیب و فراز میں صابرؔ
ہر ایک لغزشِ پا پر سنبھالتا ہے مجھے

○

حیات کیا ہے مآلِ حیات کیا ہو گا
تو اِس پہ غور کرے گا تو غم زدا ہو گا

سنبھل سنبھل کے جو یوں پتھروں پہ چلتا ہے
ضرور اُس کی حفاظت میں آئینا ہو گا

جو کہہ رہا ہے کہ نیند اُڑ گئی ہے آنکھوں سے
یہ شخص پہلے بہت خواب دیکھتا ہو گا

سُنا کیا جو مِرا حال اِس توجّہ سے
وہ اجنبی بھی کسی غم میں مُبتلا ہو گا

کسی کے ربط و تعشّق پہ اِتنا ناز نہ کر
حنا کا رنگ ہے دو روز میں ہوا ہو گا

جوان ہوتا تو پاگل ہوا سے لڑتا بھی
درخت تھا وہ پُرانا اُکھڑ گیا ہو گا

یہ خِشت خِشت بِکھرتا ہوا کھنڈر صابر
کبھی نہ جانے یہ کس کا محل سرا ہو گا

○

وہ جانیوالا تھا کب یوں حریمِ جاں سے پرے
کہیں سے کوئی تو اُس کو پُکارتا ہو گا

# تاثرات

"کارواں خیالوں کے" اور "دھرتی کی خوشبو" کے مصنّف نو بہار صابر کے شاعرانہ اوصاف کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ شاعری کے فنّی رموز و نکات پر ان کی گہری نظر ہے اور وہ چیز جسے شعرگوئی کا سلیقہ کہتے ہیں قدرت نے انھیں فیّاضی کے ساتھ عطا کیا ہے۔

گوپال متّل

جناب نو بہار صابر کا مجموعہ کلام 'کارواں خیالوں کے' مجھے اتنا پسند آیا کہ بارہ بجے دن سے غروب آفتاب تک پوری کتاب پڑھے بغیر ہاتھ سے نہیں رکھ سکا۔

فیّاض گوالیاری

متحدہ پنجاب میں اُردو غزل کا کھویا ہوا وقار واپس پھیرنے والوں میں جناب نو بہار صابر کا نام سرِفہرست ہے۔

پریم کمار نظر

اپنے دَور کی نمائندہ آوازوں کے ساتھ اپنی آواز ملانا نو بہار صابر کی ایسی صفت ہے جو اُن کے فکر و فن کی ارتقا پذیری، ترقّی پسندی اور بیداری کا ثبوت ہے۔

بشیر بدر

اگر ڈانٹے، ملٹن اور اقبال کے تبلیغی ادب کو ادب کے دائرے سے خارج نہیں کیا جاسکتا تو "دھرتی کی خوشبو" میں شامل شدہ نظموں پر بھی نعرہ بازی کا لیبل لگا کر اور وقتی یا ہنگامی کہہ کر رَد نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ شاعر نے اپنے افکار کی ترسیل اور اپنے تصوّرات کی تبلیغ بڑے سلیقہ اور شعور کے ساتھ کی ہے اور اس مجموعے کی نظمیں اپنی مقصدی اور افادی حیثیت رکھنے کے باوجود معیاری ادب کا نمونہ کہی جاسکتی ہیں۔

نادم شش پرتابگڈھی

'دھرتی کی خوشبو' کے مصنف نوبہار صابر کو قدرت نے ایسا خوبصورت فن دیا ہے جو کم از کم پنجاب میں کسی اور کو نہیں ملا۔

عرش ملسیانی

میری نظر میں نوبہار صابر ایک جامعِ کمالات اور نادرۂ روزگار ہستی ہیں۔ انھیں نظم، غزل اور رباعی پر یکساں مہارت حاصل ہے۔ ان کی شاعری روایت اور بغاوت کا دل آویز امتزاج ہے۔

کنہیا لال کپور

صابر صاحب نے وقت کے ہر تقاضے کو پورا کیا ہے۔ پہلے ترقی پسند شعرا کے ہمنوا رہے اب نئے رنگ میں شاعری کرنے لگے ہیں اور اس محبوبی انداز سے کرنے لگے ہیں کہ مجھ ایسا کافر بھی نئی شاعری کی عظمت کا قائل ہو گیا ہے۔

کرپال سنگھ بیدار

ریشہ دار لوبیا بحر کی نرم گرانی اردو انجمن کی نمایندگی

شمس الدین حیدرآباد

شتری ۶ رہ لوزاں دفتر

لعم = اور بیشتر ماخ وفتی فضل = بیشہ ٪ = ۶۵ مس

فتی عالم